برِ صغیر پاک و ہند
کے
قدیم عربی مدارس
کا
نظامِ تعلیم

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

برصغیر پاک و ہند

کے

قدیم عربی مدارس کا نظامِ تعلیم

بختیار حسین صدیقی

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ، لاہور

134720

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل ۱۹۸۲

تعداد ۱۱۰۰

مطبع .. .. کمبائن پرنٹرز۔ بلال گنج
لاہور

ناشر : .. محمد اشرف ڈار (معتمد)
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

Marfat.com

فہرست مضامین

پیش لفظ — د

۱ - باب اوّل

میراث تاریخ — ۱ تا ۹ صفحہ

۲ - باب دوم

اعلیٰ تعلیم کا نصاب — ۱۰ تا ۳۵

۳ - باب سوم

طریقِ تعلیم — ۳۶ تا ۴۵

۴ - حوالہ جات — ۴۵ تا ۶۸

Marfat.com

پیش لفظ

برصغیر پاک و ہند کے باشندے ابتدائی صدی ہجری ہی میں اسلام سے آشنا ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں یہاں اسلامی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں حالات کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔

اس خطۂ ارض میں بے شمار علما نے مدرسے قائم کیے اور درس و تدریس کی مسندیں بچھائیں، یہاں کے متعدد ملوک و سلاطین نے بھی اس میں پوری دلچسپی لی اور سرکاری حیثیت سے اہل علم کو تدریس کی خدمت انجام دینے پر مامور کیا۔ اس طرح طلبا کی علمی و فکری تربیت کے لیے وہ تمام وسائل اختیار کیے گئے، جن کا اختیار کرنا وقت کے تقاضے کے مطابق ضروری تھا۔ لیکن اس زمانے میں کوئی خاص نصاب تعلیم مرتب نہیں ہوا تھا، تعلیم و تعلم کے اسالیب و مضامین معلمین نے اپنی صوابدید اور طلبا کی ذہنی سطح کے مطابق مقرر کیے تھے، باقاعدہ نصابِ تعلیم ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱/۱۷۴۸) نے ترتیب دیا جو اپنے مرتب کے نام کی مناسبت سے "درس نظامیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

اس کتاب میں جو "برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس کا نظامِ تعلیم" کے نام سے موسوم ہے، اس سلسلے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے فاضل مصنف پروفیسر بختیار حسین صدیقی صاحب کا اصل موضوع تعلیم و تدریس ہے اور اسی میں ان کی زندگی کے شب و روز بسر ہوئے ہیں۔ پہلے وہ گورنمنٹ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن فارمین (لاہور) میں معلم تھے۔ آج کل پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور سے منسلک ہیں۔

ان کا معلمی کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے عربی و دینی نظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس کی تاریخ بیان کر دی ہے اور ساتھ ہی تجزیہ بھی کیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع سے متعلق تمام اہم اور بنیادی معلومات کو محیط ہے۔

ہم جناب یوسف طلال علی (مشیر تعلیم برائے عربی و اسلامیات وفاقی وزارت تعلیم) کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور ذمے داریوں کے باوجود اس مسودے کو بالاستیعاب پڑھا اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

محمد سعید شیخ

ڈائریکٹر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

Marfat.com

باب اوّل

میراث تاریخ

برصغیر پاکستان و ہند میں عربوں نے سب سے پہلے سندھ اور ملتان کے علاقے فتح کیے۔ ابوحفص بن ربیع محدث بصری (م۔ ۷۷۶ء) اسی دور میں سندھ آئے تھے وہ تبع تابعین میں سے تھے اور خیال کیا جاتا ہے کہ احادیث روایت کرنے کی بنا پر وہ اس علاقے میں مرکزی اہمیت کے حامل رہے ہوں گے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ پر قبضہ کیا لیکن اس کے اثرات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ جلد ہی سندھ کی اہمیت ختم ہوگئی۔ ۹۸۰ء کے قریب ملتان پر قرامطہ نے قبضہ کرلیا اور اسے اپنے عقائد کی اشاعت کا مرکز بنالیا۔

برصغیر ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا قیام: عربوں کے بعد غزنویوں کا دور آیا۔ اس خاندان کے مشہور حکمراں محمود غزنوی نے ۴۱۷ھ/ ۱۰۲۶ء میں پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ وہ علم و دانش کا دلدادہ تھا۔ اس نے دور دراز ایشیائی ممالک کے ممتاز علما کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ خود بھی فارسی کے علاوہ عربی کا عالم تھا۔ اس نے فقہ پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام التفرید فی الفروع ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ محمود غزنوی کے عہد میں غزنی علم و فضل کا مرکز تھا۔ اس نے یہاں ایک دارالعلوم بھی قائم کیا جس کا

Marfat.com

مہتمم ممتاز عالم اور شاعر عنصری تھا۔[۲] محمود کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے لاہور کو اپنی سلطنت کے ان علاقوں کا دار الحکومت بنایا جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع تھے اور اس کے بعد یہ شہر ہر زمانے میں اسلامی علوم کا اہم مرکز بنا رہا۔ غزنی کا تمام علم اسی راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ شیخ محمد اسماعیل (م - ۱۰۵۶ ء) پنجاب میں آنے والے سب سے پہلے محدث اور مفسر تھے۔ انھوں نے مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور میں سکونت اختیار کی۔[۳]

اسلامی ممالک میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس اور مکاتب کے قیام کا عام رواج تھا محمود غزنوی اور اس کے امرا کے توسط سے یہ طریقہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ محمود غزنوی نے غزنی میں جو دار العلوم کھولا وہ ایک مسجد ہی کے پہلو میں تھا، جسے مسجد "عروس فلک" کہتے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس مسجد کا مفصل حال لکھا ہے۔ برصغیر کو غزنی، دمشق اور بغداد سے صرف مسجد میں مدرسے قائم کرنے کی روایت ہی ورثے میں نہیں ملی بلکہ یہ مدرسے ایک پورا انتظام تعلیم اپنے ساتھ لائے جو ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے تین درجوں پر مشتمل تھا۔ طریق تعلیم اور نصاب تعلیم بھی ان کے ساتھ آیا جس میں مقامی ضروریات کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی کر لی گئی۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اس روایت پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے جو مسلم ہندوستان کو ورثے میں ملی۔

تعلیم کی اسلامی روایت : بچے کی غیر رسمی تعلیم کا گہوارہ خاندان ہوتا ہے مسلمان گھرانوں میں بھی، دوسرے گھرانوں کے مانند، بچے کی غیر رسمی تعلیم خاندان ہی کی ذمہ داری تھی خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے بچہ جس طریقے سے تعلیم حاصل کرتا ہے، اسے ای۔ ڈی۔ میرز (E. D. MYERS) کے الفاظ میں "کار آموزی" (APPRENTICESHIP) کا طریقہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طریقہ آموزش میں بچہ خاندان کے دوسرے لوگوں کا مشاہدہ کرکے ان کی حرکات و سکنات کی نقل اتارتا ہے۔ مادری زبان، رسوم و رواج، عادات و اطوار، پسند ناپسند، کھیل کود اور ہنر وغیرہ سب کچھ وہ اسی طریقے سے سیکھتا ہے۔ جیسے ہی وہ بولنے کے قابل ہوتا ہے، والدین اسے کلمہ طیبہ پڑھنا سکھاتے ہیں۔ ذرا اور بڑا ہوا تو نماز کی سورتیں زبانی یاد کراتے ہیں۔ سات سال کی عمر کو پہنچا تو سختی سے نماز پڑھنے کی تاکید شروع ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

ابتدائی تعلیم کا مرکز مسجد تھی۔ چھ یا سات سال کی عمر میں بچہ مسجد سے ملحق مدرسے میں داخل ہوتا تھا، جہاں قرآن بنیادی درسی کتاب کا کام دیتا تھا۔ شاگرد کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ وہ صحیح قرآن پڑھنا سیکھے اور اسے زبانی یاد کرے۔ نصاب میں شروع سے آخر تک اصل زور حفظ پر تھا۔ اکثر جگہوں پر تین سال کی مدت میں پورا قرآن حفظ کرنا پڑتا تھا۔ حروف علت یا تلفظ کی غلطی گناہ تصور کی جاتی تھی۔ اس لیئے پوری صحت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنا اور اسے زبانی یاد کرنا تعلیم کا اصل مقصود تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں ایک مسافر نے دمشق میں دیکھا کہ بچے تختی پر قرآن کی آیات کے بجائے عربی اشعار لکھنے کی مشق کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ قرآن کے مقدس الفاظ کو تختی پر لکھ کر مٹانے اور دوبارہ لکھنے میں اس کی بے حرمتی کا ایک پہلو نکلتا تھا۔ دوسرے مکاتب اتنے ہوشمند نہیں تھے۔ وہ قرآن کو پڑھنے اور لکھنے دونوں کے لیئے استعمال کرتے تھے۔ ابتدائی مدارس کا نصاب صرف قرآن پڑھنے اور لکھنے پر مشتمل نہیں تھا۔ ان میں قواعد، کتابت، حساب اور عربی اشعار کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور نبی اکرم کے حالات زندگی بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اساتذہ، بالخصوص اعلیٰ جماعتوں کے اساتذہ کی بڑی عزت کی جاتی تھی، بعد میں ابتدائی مدارس کے اساتذہ کا درجہ گھٹ گیا، شاید اس لیئے کہ ہر شخص جو معمولی لکھنا پڑھنا جانتا ہو یہ کام کر سکتا تھا۔ امیر والدین اپنے بچوں کو مکتب بھیجنے کے بجائے اتالیق مقرر کرتے تھے جو انھیں پڑھانے گھر آتے تھے۔ نصاب وہی تھا جو مکتب میں رائج تھا، البتہ ان کی تعلیم میں عربی ادب اور شاعری پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔

ابتدائی مدارس کی طرح ثانوی مدارس بھی مسجدوں میں قائم ہوئے۔ ان مدارس کا نصاب قرآن اور حدیث کے مطالعے پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ان میں عربی زبان، ادب اور قواعد کی تعلیم دی جاتی تھی اور تفسیر اور فقہ پڑھائے جاتے تھے۔ بعد میں نجی ثانوی مدارس وجود میں آئے۔ نامور استاد اپنے اپنے گھروں میں ان علوم کی تعلیم دیتے تھے جو مسجد کے مکتبوں میں نہیں پڑھائے جاتے تھے، بالخصوص ان یونانی علوم کی جن تعلیم کے ترجمے بیت الحکمت میں ہوئے جس کی بنیاد خلیفہ المامون نے ۸۳۰ء میں رکھی تھی۔ سلجوقی ترکوں کے وزیر نظام الملک نے پہلا سرکاری ثانوی مدرسہ ۱۰۶۶ء میں بغداد میں قائم کیا جو اس کے نام پر نظامیہ بغداد کہلایا۔ فلپ حتی کے الفاظ

Marfat.com

میں یہ پہلی حقیقی اکیڈمی [؎] تھی جو دنیائے اسلام میں قائم ہوئی، کیونکہ اس میں پہلی مرتبہ طلبا کی جسمانی، ذہنی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کیا گیا جو بعد کے مدارس کے لئے ایک نمونہ بن گئی۔ نصاب قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور عربی شاعری، ادب اور قواعد پر مشتمل تھا حفظ پر زور بدستور قائم رہا۔ بارھویں صدی تک عراق کے مدارس اسلامی دنیا میں تعلیم کا مرکز بنے رہے۔ نصاب اور تنظیمی امور میں انھوں نے مصر، اسپین اور بعد میں برصغیر کے مدارس پر اثر ڈالا۔ [؎]

عثمانی ترکوں کے زمانے تک تعلیمی نظام نے ابتدائی مدارس، ثانوی مدارس اور اعلیٰ مدارس کی واضح اور نمایاں شکل اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی مدارس بدستور مسجدوں سے ملحق رہے جن میں قرآن، لکھنے، پڑھنے، قواعد حساب اور عربی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظام الملک نے ثانوی تعلیم کو مسجد سے الگ کیا اور علیحدہ عمارتوں میں ثانوی مدارس قائم کرنے کی ابتدا کی۔ صلاح الدین ایوبی اور نورالدین محمود زنگی نے اس مہم کو آگے بڑھایا۔ رفتہ رفتہ خطابت، منطق، فلسفہ، ہندسہ اور ہیئت کے یونانی علوم ثانوی مدارس کے نصاب میں داخل ہوئے جو ان کے علاوہ صرف، نحو، لسانیات، علم بیان اور علم معانی کے مضامین پر مشتمل تھا۔ اعلیٰ مدارس میں وہ تمام علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا تعلق قرآن اور حدیث سے تھا مثلاً تفسیر، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام اور علم الفرائض۔

اسپین میں تعلیم ایک نجی معاملہ تھی، لیکن وسیع پیمانے پر اس کا تسلی بخش انتظام تھا۔ نصاب تعلیم وہی تھا جو دوسرے اسلامی ممالک میں رائج تھا، البتہ قرطبہ اور غرناطہ میں نباتیات، حیوانیات، فلکیات، ہندسہ، طب، کیمیا، فلسفہ اور منطق کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔

یہی علمی سرمایہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو تاریخ سے ورثے میں ملا اور رفتہ رفتہ غزنی، غور اور خراسان کے راستے لاہور، دہلی، آگرہ، اجمیر اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پہنچا۔ اس میراث کے مطابق ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج ہوا اس میں ابتدائی مدارس، ثانوی مدارس اور اعلیٰ مدارس کی تقسیم بجنسہٖ قائم رہی اور ان مدارس کا نصاب بھی کم و بیش وہی رہا جو دوسرے اسلامی ممالک میں رائج تھا۔ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کی صرف ابتدائی تعلیم اور

Marfat.com

بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے نصاب سے بحث کی جائے گی۔

غیر رسمی ابتدائی تعلیم: رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: "بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بناتے ہیں۔" اس حدیث کی رو سے یہ ذمے داری خاندان پر عائد ہوتی ہے کہ وہ بچے کو معاشرے کی ثقافتی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لیے تیار کرے۔ بچہ گھر والوں کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھتا ہے، ان کی آوازوں کو کان لگا کر سنتا ہے اور پھر ان کی نقل کرتا ہے۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ معاشرے کی زبان، معمولات، رسوم و رواج اور عقائد و اقدار اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ ثقافت پذیری (ACCULTURATION) کے اس عمل کو عمرانیات (SOCIOLOGY) کی اصطلاح میں معاشرہ سازی (SOCIALIZATION) کہتے ہیں، یعنی نومولود کو معاشرے کی ثقافت میں ڈھالنے کا عمل۔ برصغیر ہند کے مسلمان گھرانوں میں تعاشر کا عمل، دوسرے گھرانوں کی طرح، بچے کی پیدائش کے ساتھ شروع ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا تھا، نہلا دھلا کر سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دی جاتی تھی۔ توحید کی صدا پہلے ہی دن اس کے کانوں میں گونجتی تھی۔ بولنا شروع کرتا تھا تو والدین اسے "اللہ اللہ" کہنا سکھاتے تھے۔ ذرا بڑا ہوا تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پڑھنا سکھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے نماز کی سورتیں یاد کراتے تھے، یہاں تک کہ گھر والوں کو نماز پڑھتا دیکھ کر وہ خود بھی جانماز بچھا کر ان کی طرح رکوع، سجود، قعود اور قیام کرنے لگتا تھا۔ سات سال کی عمر کو پہنچ کر وہ خود ہی پانچوں وقت کی نمازیں پابندی سے پڑھنے لگتا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو ماں باپ اس سلسلے میں اس پر سختی کرتے تھے۔

رسمی ابتدائی تعلیم: یہ تو ہوئی بات بچے کی غیر رسمی ابتدائی تعلیم کی۔ اب آیئے رسمی تعلیم کی طرف۔ اس کی ابتدا "بسم اللہ" کی رسم ادا کرنے سے ہوتی تھی۔ جونہی بچہ چار سال، چار ماہ اور چار دن کا ہوا والدین اس کی رسم "بسم اللہ" ادا کرتے تھے اور رات ادب پہلے دن ہی تبرکاً اسے پہلا سبق دیتا تھا۔ امیر والدین اس موقع پر اپنے بچوں کو چاندی کی دوات میں زعفران کی روشنائی بنا کر چاندی کا قلم تختی لکھنے کے لیے لا کر دیتے تھے اور حسب استطاعت سارے محلے اور مدرسے میں شیرینی تقسیم کرتے تھے۔ اس شان سے بچہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے محلے کی مسجد

Marfat.com

سے ملحق مدرسے میں داخل ہوتا تھا۔ یہاں استاد اسے بغدادی قاعدے کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کراتا تھا۔ پہلے تیسواں پارہ اور پھر پہلے سے انتیسویں پارے تک ناظرہ قرآن ختم کراتا تھا۔ ہر محلے کی مسجد میں پیش امام کے حجرے میں بچوں اور بچیوں کی مخلوط تعلیم کا ایک مکتب ہوتا تھا۔ قرآن مجید اور مسئلے مسائل کے علاوہ یہاں اُردو لکھنے پڑھنے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو والدین مطالبہ کرتے تھے ان کے بچوں کو ابتدائی حساب اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ نصاب کے معاملے میں مکتب قطعی آزاد تھے۔ استاد اپنی مرضی سے اُردو، فارسی اور ابتدائی حساب کی کوئی کتاب منتخب کر لیتا تھا اور شاگرد اسے خرید لیتے تھے۔ اُردو اور فارسی کا جو سبق بچے پڑھتے تھے اسے روزانہ تختی پر لکھتے تھے۔ اس طرح جہاں سبق یاد ہو جاتا تھا وہاں ہجے ٹھیک ہو جاتے تھے اور خط اچھا ہو جاتا تھا۔ گنتی اور پہاڑے بچے کورس (CHORUS) کی صورت میں یاد کرتے تھے اور پھر تختی پر لکھتے تھے۔ یہ طریقہ آج بھی مکتبوں، مدرسوں اور پرائمری اسکولوں میں رائج ہے۔

"آموختہ" پڑھنا: ابتدائی تعلیم میں، دیگر اسلامی ممالک کی طرح، اصل زور حفظ کرنے پر تھا۔ چھوٹے بچوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے اس لیے آموزش کا مطلب زیادہ تر سبق کے الفاظ یاد کرنا تھا۔ رٹنا، بغیر سمجھے ہوئے الفاظ کو دہرانا شاگرد کا اصل کام تھا۔ آج کل کی طرح مکتبوں میں آموزش کا جائزہ یا امتحان لینے کی کوئی رسم نہ تھی۔ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانوں کا کوئی دستور نہ تھا۔ اس کی بجائے یہاں "آموختہ" پڑھنے اور سننے کا دستور تھا اور اسی کے ذریعے آموزش کی جانچ کی جاتی تھی۔ بچہ جو سبق پڑھتا تھا استاد روزانہ اس کا "آموختہ" سنتا تھا۔ جوں جوں وہ تعلیم میں آگے بڑھتا جاتا تھا روزانہ کے بجائے ہفتے میں تین بار، دو بار اور پھر صرف ایک دن "آموختہ" سنا جاتا تھا۔ جمعہ کو مکتبوں میں پوری چھٹی ہوتی تھی اور جمعرات کو آدھی چھٹی۔ یہ نصف دن صرف "آموختہ" پڑھنے اور سننے کے لیے وقف ہوتا تھا۔ ذہین طلبا کم ذہین طلبا کا "آموختہ" سنتے تھے۔ استاد دونوں کی نگرانی کرتا تھا، ضرورت پڑنے پر ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ "آموختہ" سننے کے دو فائدے تھے۔ بچوں نے جو کچھ پڑھا ہوتا تھا وہ روز بروز پختہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ استاد کو اس بات کا اندازہ ہوتا

Marfat.com

رہتا تھا کہ کس بچے نے کس حد تک پچھلے سبقوں کو یاد رکھا ہے۔ "آموختہ" پڑھنا طریق آموزش تھا تو "آموختہ" سننا آموزش کے جائزے کا طریقہ۔

محلہ مکتب: مسجدوں سے ملحق مدارس کے علاوہ بعض معزز پردہ نشین خواتین اپنے اپنے گھروں میں بچیوں اور چھوٹے بچوں کو ناظرہ قرآن اور مسائل روزہ و نماز کی تعلیم دیتی تھیں۔ لڑکیوں کو سینے اور کاڑھنے کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔ ان پرائیویٹ استانیوں کی بے انتہا عزت کی جاتی تھی۔ محلے میں ان کا ایک خاص مقام ہوتا تھا۔ جب کوئی لڑکی یا لڑکا قرآن مجید ختم کر لیتا تھا تو ان کو باقاعدہ ہدیہ پیش کیا جاتا تھا۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ نے اس روایت کو تقویت پہنچانے اور اسے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دینے پر زور دیا ہے۔ اگلے پنج سالہ منصوبے کے تحت پاکستان میں اس طرز کے پانچ ہزار محلہ اسکول کھولے جائیں گے جن میں طلبہ کو مفت کتابیں مہیا کی جائیں گی اور ان کی منتظم خواتین کو مناسب تنخواہ دی جائے گی۔

آتون جی: معزز گھرانوں میں قائم ان مکتبوں سے عام مسلمانوں کی لڑکیاں مستفید ہوتی تھیں۔ متوسط الحال اور خوشحال گھرانوں میں استانیاں باقاعدہ ملازم رکھی جاتی تھیں۔ محلدار، انا اور دودا کے ساتھ ساتھ ان گھروں میں "آتون" بھی ہوتی تھی۔ آتون کا گھر میں ایک خاص مقام ہوتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو ناظرہ قرآن پڑھاتی تھی۔ نماز روزے کے مسائل بتاتی تھی، سینا پرونا اور کشیدہ کاری کا کام سکھاتی تھی اور بالخصوص میلاد شریف پڑھنے کی تعلیم دیتی تھی۔ رسول کریمؐ کے حالات زندگی پر مشتمل "میلاد اکبر" کو خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ ان گھروں میں اکثر محفل میلاد النبی منعقد ہوتی تھی۔ محلے کی عورتیں اس میں شرکت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں اور صاحب خانہ کی بیٹی عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ میلاد پڑھتی تھی میلاد کے اختتام پر شیرینی تقسیم کی جاتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم: اعلیٰ تعلیم سے ہماری مراد وہ تعلیم ہے جو برصغیر پاک و ہند کی قدیم درس گاہوں میں درجۂ "فضل" کے طلبہ کو دی جاتی تھی اور جس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے پر انھیں "دستار فضیلت" باندھنے اور "طیلسان" پہننے کی اجازت ملتی تھی۔ اس کے نصاب میں جو کتب شامل تھیں

Marfat.com

انھیں کتب منتہیانہ" کہتے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی میں غزنوی حکمرانوں کے زمانے سے لے کر انیسوی صدی عیسوی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک معیار فضیلت بلند کرنے کے لیے اس کا نصاب کئی مرتبہ بدلا گیا۔ مولانا ابو الحسنات ندوی نے اس کے ارتقا میں پانچ ادوار کی تحقیق کی ہے جن سے ہم اگلے باب میں فرداً فرداً بحث کریں گے۔

نصاب سازی کے اصول: تعلیم کا اصل مقصد نوجوان نسل کو معاشرے کی ثقافتی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہر معاشرے یا قوم کی ثقافت مختلف ہوتی ہے جو اسے دوسرے معاشروں یا قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔" ثقافت ایک پیچیدہ اور مکمل نظام حیات ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، رسم و رواج اور دوسری اہلیتیں اور عادات شامل ہیں جو انسان کسی معاشرے کے رکن کی حیثیت سے سیکھتا ہے[۹]" یہ ایک مکمل" نظام کردار" ہے جو کسی معاشرے کے افراد میں رائج ہو اور جو اس کے ہر رکن کے لئے ایک معیار کا کام دے۔ اسلامی ثقافت کی روح رواں توحید کا تصور ہے۔ یہ تصور خدا کے حیّ و قیوم ہونے کا تصور ہے، اس کی ذات کے پاک بے عیب ہونے کا تصور ہے، اس کے کسی ہمسر و شریک کے نہ ہونے کا تصور ہے۔ کائنات کی وجودیاتی اساس ہونے کا تصور ہے کیونکہ وہی اس کا خالق ہے اور رب بھی۔ وہ وجود مطلق ہے اور ہر شے اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج ہے۔ وہ ہر شے سے بے نیاز ہے لیکن بے غرض تماشائی ہرگز نہیں۔ اسے اپنے بندوں سے پیار ہے۔ وہ ان کی فلاح کا خواہاں ہے۔ وہ کبھی انھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا۔ مجھ سے دعا مانگو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ تم جہاں بھی ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں۔ جس معاشرے کی بنیاد خدا کے ایسے حیات پرور تصور پر ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نصاب تعلیم توحید کے تصور کا آئینہ دار ہو۔ قرآن توحید کے تصور کی نظری تفسیر ہے تو حدیث اس کی عملی تفسیر۔ پس یہ دونوں نصاب کی بنیادی اکائی ہوئے اور تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث وغیرہ ان کی ناگزیر فروع۔ یہ علوم عالیہ مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب آیئے ان علوم کی

طرف جو علوم عالیہ کے مطالعے کے لیے وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث عربی زبان میں ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لیے عربی جاننا ضروری ہے۔ پس عربی ادب، صرف، نحو، معانی، بیان اور فن بلاغت کا نصاب میں شامل ہونا ناگزیر ہوا۔ ابتدائی تعلیم کا تعلق زیادہ تر حافظے سے تھا۔ اعلیٰ التعلیم کی غرض و غایت قوت فکر کی نشو و نما ہے، جس کے بغیر توحید کے تصور کی گہرائیوں تک رسائی ممکن نہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے منطق، فلسفہ اور علم کلام نصاب میں داخل ہوئے۔ عقل و فکر علم حق کی پہلی منزل ہے۔ اس کی آخری منزل وجدان ہے۔ یہ اپنے من میں ڈوب کر راز توحید پانے کا نام ہے۔ اس قسم کی تربیت کے لیے تصوف کا مطالعہ ضروری ہے جو امام غزالی (م۔ ۱۱۱۱ء) کی وجدانیات کے زیر اثر اسلامی نصاب کا لازمی جزو بنا۔ پس نصاب کو اگر صرف علوم متداولہ تک محدود رکھا جائے تو اسے منقولی علوم، لسانی علوم، معقولی علوم اور وجدانی علوم کا ایک کامیاب امتزاج ہونا چاہیے جس میں بالادستی منقولی علوم کی ہو اور باقی علوم کا مقام وسیلے یا آلے کی حیثیت سے ان کی اہمیت کے مطابق متعین کیا گیا ہو۔

Marfat.com

باب دوم

اعلیٰ تعلیم کا نصاب

برصغیر پاک و ہند کے اعلیٰ مدارس کے نصاب پر سب سے پہلا محققانہ مضمون بعنوان "ہندوستان کا نصاب درس" مولانا سید عبدالحیٰ صاحب ناظم ندوۃ العلما لکھنو نے ۱۹۰۹ء کے رسالہ الندوہ میں لکھا۔ اپنے طریقہ تحقیق کی بابت وہ اس مضمون میں لکھتے ہیں: "مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دور قائم کریں اور جو کتابیں ہر دور میں مروج تھیں ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے، سیر سے، مشائخ کے طبقات سے، شعرا کے تذکروں سے اور مکتوبات و ملفوظات سے مل سکتی ہے، یک جا کر دیں۔"[1] کچھ مدت بعد مولانا ابوالحسنات ندوی نے اس موضوع پر تحقیق و تدقیق شروع کی۔ وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کا خلاصہ یہ ہے: "میں نے بھی مختلف کتب تاریخ و سیر کی ورق گردانی کی، لیکن ہر قدم پر مجھے مولانا (سید عبدالحی) کی تصریحات سے اتفاق کرنا پڑا اور مزید اضافے کی کوئی گنجائش نہ نکلی۔ اس بنا پر میں نے غیر ضروری کاوش سے قطع عمل کر کے مولانا ممدوح ہی کی تصریحات کو اس موقع پر نقل کر دینا بہتر خیال کیا، چنانچہ قریب قریب مولانا ہی کے الفاظ میں نصاب درس کی یہ تمام تصریحات اس موقع پر نقل کی جاتی ہیں"[2] بہرحال مولانا سید عبدالحی نے جہاں "نصاب درس کے چار دور قائم" کیے تھے، وہاں ابوالحسنات ندوی نے پانچ دور قائم کیے[3] جن کی طرف اب ہم رجوع کرتے ہیں۔

Marfat.com

دورِ اوّل کا نصاب: جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے برصغیر پاک و ہند میں عربوں نے سب سے پہلے سندھ اور ملتان کے علاقے فتح کیئے، لیکن اس فتح کے اثرات دیرپا ثابت نہ ہوئے ہندوستان میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کی داغ بیل محمود غزنوی نے ڈالی جس نے ۱۰۲۶ء میں پنجاب فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے بیشتر مغربی حصے پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ تلوار کا کام ختم ہوتے ہی کتاب و قلم کا کام شروع ہو گیا۔ غزنی، غور اور خراسان کا علم ہندوستان پہنچ گیا۔ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے لیئے مدارس قائم ہوئے اور مقامی ضروریات کے مطابق ان کے لیئے نصاب وضع کیا گیا۔ درجۂ فضل کا جو پہلا نصاب بنایا گیا اور جو بارھویں صدی عیسوی اور پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان تقریباً دو سو سال تک رائج رہا، اس کی تفصیل[۱۳] یہ ہے۔

۱۔ **علم نحو:** ۱۔ مصباح[۱۴]، ۲۔ کافیہ[۱۵]، ۳۔ لب الالباب[۱۶]، ۴۔ ارشاد[۱۷]،
(بعد میں اضافہ ہوا)

۲۔ **فقہ:** ہدایہ[۱۸]۔

۳۔ **اصول فقہ:** ۱۔ منار الانوار[۱۹] اور اس کی شرح، ۲۔ اصول بزدوی[۲۰]

۴۔ **تفسیر:** ۱۔ مدارک[۲۱]، ۲۔ بیضاوی[۲۲]، ۳۔ کشاف[۲۳]

۵۔ **تصوف:** ۱۔ عوارف المعارف[۲۴]، ۲۔ فصوص الحکم[۲۵]، ۳۔ نقد النصوص[۲۶]،
۴۔ لمعات[۲۷]۔ (آخری دو کتابیں بعد میں ان مدارس میں رائج ہوئیں جن کے ساتھ خانقاہیں ملحق تھیں)

۶۔ **حدیث:** ۱۔ مشارق الانوار[۲۸]، ۲۔ مصابیح السنہ[۲۹] (مشکوٰۃ المصابیح کا متن)

۷۔ **ادب:** مقامات حریری[۳۰]۔ (یہ کتاب زبانی یاد کی جاتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شمس الملک استاذ شمس الدین خوارزمی سے مقامات حریری پڑھی تھی اور چالیس مقالے آپ کو زبانی یاد تھے)۔

۸۔ **منطق:** شرح شمسیہ[۳۱] یا قطبی

Marfat.com

۹۔ کلام : ۱۔ شرح صحائف[32]، ۲۔ تمہید ابوشکور[33] سالمی (یہ کتاب بعض بعض مقامات پر پڑھائی جاتی تھی)۔

تبصرہ : یہ نصاب نو علوم پر مشتمل تھا جس میں کل بیس کتابیں شامل تھیں۔ معیار فضیلت فقہ، اصول فقہ[34] اور تصوف[35] (صحبت اور بیعت کے ذریعے کردار میں استواری اور عقائد میں پختگی پیدا کرنا) کے علوم تھے۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بساط جن خانوادوں نے بچھائی تھی وہ غزنی اور غور سے آئے تھے جہاں فقہ اور اصول فقہ کا پایہ بلند تھا (خود محمود غزنوی نے فقہ پر ایک کتاب التفرید فی الفروع لکھی جس کی صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ نے بہت تعریف کی ہے) جہاں طلبہ کو لذت کردار" سے آشنا کرنے کے لیے تصوف کی تعلیم کو ضروری سمجھا جاتا تھا جس کا ذوق غزالی (م۔ ۱۱۱۱ء) نے لوگوں میں پیدا کیا۔ وہاں معقولات سے لوگوں کو کوئی خاص رغبت نہ تھی؛ اس کے کم کرنے میں غزالی کی تہافت الفلاسفہ نے ایک اہم کردار ادا کیا جس میں حدیث اور اصول حدیث سے دلچسپی کی کوئی قابل ذکر روایت نہ تھی۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مولانا شمس الدین ترک ایک محدث مصر سے آکر ملتان میں آباد ہوئے تاکہ ہند میں علم حدیث کو رواج دیں لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ سلطان نہ تو نماز پڑھتا ہے اور نہ جمعہ کے دن مسجد کا رخ کرتا ہے تو مایوس ہو کر مصر واپس چلے گئے۔ چلتے وقت بادشاہ کو ایک طویل اور دلچسپ خط لکھا، جو ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں موجود ہے، اس میں اسے "بہت کچھ غیرت دلائی تھی کہ ہندوستان میں حدیث کی طرف سے بے اعتنائی پھیلی ہوئی ہے" لیکن زمانہ ساز مولویوں نے یہ خط بادشاہ تک پہنچنے نہیں دیا۔ حدیث میں صرف مشارق الانوار پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ جس کے ہاتھ مصابیح آجاتی تھی اسے بہت بڑا محدث خیال کیا جاتا تھا منطق میں شرح شمسیہ اور کلام میں شرح صحائف پر معقولات کی کل تعلیم مشتمل تھی لیکن تصوف کا نصاب رفتہ رفتہ بڑھ کر دو سے چار کتابوں تک پہنچ گیا اور ہونا بھی یہی تھا کیونکہ اسی زمانے میں لاہور میں علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخش رح (م۔ ۴۶۵ھ) اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی رح (م۔ ۱۲۳۶ء) اور دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا رح

Marfat.com

(م۔ ۱۳۲۴ء) کا فیض جاری وساری تھا۔

دورِ دوم کا نصاب: اس دور کا آغاز ۱۴۸۹ء میں سکندر لودھی کی تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ عہد سکندری میں دہلی ارباب علم وفضل کا مرکز تھا۔ اسی زمانے میں شیخ عبداللہ (م۔ ۱۵۱۶ء) اور شیخ عزیز اللہ[۳۶]۔ دو بھائی، ملتان سے دہلی آئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سکندر نے ان دونوں کا بڑے تزک و احتشام سے خیر مقدم کیا۔" شیخ عبداللہ کو اس نے دہلی میں رکھ لیا اور مولانا عزیز اللہ کو سنبھل (مراد آباد) بھیج دیا جو اس زمانے میں اس علاقے کا مرکزی شہر تھا۔ سکندر شیخ عبداللہ کے علم وفضل کا بڑا مداح تھا۔ جب وہ درس دیتا تو سکندر خاموشی کے ساتھ درس گاہ کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا تاکہ درس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ کچھ ان دونوں بھائیوں کے فضل و کمال اور کچھ بادشاہ کی قدر شناسی سے جلد ہی ان کی علمی عظمت کی ساکھ سارے ہندوستان میں بیٹھ گئی۔ ان حضرات نے "سابق معیارِ فضیلت کو کسی قدر بلند کر دیا۔ قاضی سراج الدین اور قاضی عضدالدین کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی مفتاح العلوم داخل نصاب کیں۔۔۔۔ اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطوّل اور مختصر کی بنیاد ڈالی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ اسی زمانے میں شرح وقایہ اور شرح جامی بھی رفتہ رفتہ داخل نصاب ہو گئیں[۳۷]"۔ ملا بدایونی اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی دونوں کی تحقیق یہ ہے کہ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ نے ہندوستان میں معقولات کو رواج دیا۔ ورنہ اس سے پہلے یہاں لوگ منطق میں شرح شمسیہ اور کلام میں شرح صحائف کے علاوہ فلسفے میں کسی دوسری کتاب کا نام بھی مشکل سے جانتے تھے[۳۸]۔

ابو الحسنات ندوی نے طوالت کے ڈر سے، دورِ دوم کے نصاب میں داخل کتابوں کی فہرست نہیں دی ہے۔ بہرحال دورِ اوّل کے نصاب میں مذکورہ بالا آٹھ کتابیں شامل کر کے دورِ دوم کے نصاب کی شکل یہ بنتی ہے:

۱۔ **نحو**: ۱۔ مصباح، ۲۔ کافیہ، ۳۔ لب الالباب، ۴۔ ارشاد، ۵۔ شرح جامی

۲۔ **فقہ**: ۱۔ ہدایہ، ۲۔ شرح وقایہ[۳۹]۔

۳۔ اصول فقہ : ۱۔ منار الانوار ، ۲۔ اصول بزدوی ، ۳۔ تلویح[41]

۴۔ تفسیر : ۱۔ مدارک ، ۲۔ بیضاوی ، ۳۔ کشاف۔

۵۔ تصوف : ۱۔ عوارف المعارف ۔ ۲۔ فصوص الحکم ، ۳۔ نقد النصوص ، ۴۔ لمعات۔

۶۔ حدیث : ۱۔ مشارق الانوار ، ۲۔ مصابیح السنۃ۔

۷۔ ادب : مقامات حریری۔

۸۔ منطق : ۱۔ شرح شمسیہ ، ۲۔ شرح مطالع[42]

۹۔ کلام : ۱۔ شرح صحائف ، ۲۔ تمہید ابوشکور سالمی ، ۳۔ شرح عقائد نسفی[43] ۴۔ شرح مواقف[44]

۱۰۔ بلاغت : ۱۔ مطول[45] ، ۲۔ مختصر المعانی[46]

تبصرہ : یہ نصاب دس علوم پر مشتمل تھا۔ جس میں مجموعی طور پر اٹھائیس کتابیں شامل تھیں۔ بلاغت کا ایک نیا مضمون اس دور کے نصاب میں داخل ہوا جس میں دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، مطول اور مختصر المعانی۔ نحو میں شرح جامی، فقہ میں شرح وقایہ، اصول فقہ میں توضیح، منطق میں شرح مطالع اور کلام میں شرح عقائد نسفی اور شرح مواقف کا اضافہ ہوا۔ فقہ اور اصول فقہ کی اہمیت بدستور قائم رہی۔ حدیث سے بے اعتنائی کا وہی عالم رہا۔ منطق، کلام اور بلاغت میں دلچسپی بڑھ گئی لیکن معقولات کے اس زور شور میں تصوف کا بازار سرد نہیں پڑا۔ بہرحال سکاکی کی مفتاح العلوم (مطول اور مختصر) اور قاضی عضد کی مطالع اور مواقف "کتب منتہیانہ" قرار پائیں۔

اس دور کے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱-۱۶۴۲ء) ہیں۔ ۱۵۸۵ء میں وہ عرب گئے اور وہاں تین برس رہ کر علمائے حرمین شریفین سے فن حدیث کی تعلیم حاصل کی اور یہ تحفہ ہندستان لائے۔ انھوں نے اور ان کی اولاد نے اس فن کو یہاں فروغ دینے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی، کیونکہ یہ شرف خدا نے کسی اور کی قسمت میں لکھا تھا۔[47]

دورِ سوم کا نصاب: تیسرے دور کا آغاز ۱۵۸۳ء میں میر فتح اللہ شیرازی (م-۱۵۸۸ء) کی اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے دربار میں آمد سے ہوتا ہے۔ ہمایوں عقلی علوم کا دلدادہ تھا۔ لیکن اکبر مذہبی آزادی کا زبردست حامی تھا۔ اس معاملے میں اس کی انتہا پسندی کی وجہ سے اس کا دربار "صرف فلسفہ وحکمت کا دربار بن گیا"۔ ہندوستان میں اس وقت شیراز کے ایک مشہور معقولی عالم میر غیاث منصور کے "تفلسف اور تمنطق" کا بڑا چرچا تھا۔ اکبر کو خبر ملی کہ میر غیاث منصور کا ایک "شاگرد بے واسطہ"، میر فتح اللہ شیرازی بیجاپور آیا ہوا ہے جس کا "الٰہیات، ریاضیات، طبیعیات اور جملہ علوم عقلی ونقلی میں کوئی ثانی نہیں"۔ اکبر نے عادل خاں دکنی، والیٔ بیجاپور، کے نام ایک فرمان جاری کر کے اسے اپنے دربار میں بلوایا۔ "صدر جہانی" کے عہدے پر فائز کیا۔ امیر مظفر خاں ترہٹی کی چھوٹی بیٹی سے عقد کروایا۔ راجہ ٹوڈرمل کے "منصبِ وزارت میں شریک بنایا" اور امین الملک اور عضد الدولہ کے خطابات سے نوازا۔ اکبر کا یہی وزیر باتدبیر مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، صاحب مآثر الکرام کے الفاظ میں "ایران، خراسان وغیرہ کے علمائے متاخرین مثلاً محقق دوّانی، میر صدر الدین، میر غیاث منصور اور مرزا جان کی تصانیف ہندوستان لایا اور انھیں حلقۂ درس میں شامل کیا"۔ مہمات سلطنت میں مصروفیت کے باوجود فتح اللہ شیرازی نے درسی کتب پر حاشیہ نگاری کی اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ صرف اعلیٰ درجوں کی انتہائی کتب ہی تک ان کا درس محدود نہیں تھا بلکہ بقول ملا بدایونی وہ "امرا اور وزرا۔ کے سات آٹھ سال بلکہ اس سے بھی کم عمر کے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے"۔ ایک طرف تو وہ دوّانی، صدر شیرازی مرزا جان کی کتابوں کو ہندوستان میں پھیلا رہے تھے، شرح ملا جلال پر حاشیہ لکھتے تھے، قرآن کی تفسیر میں کتابیں لکھ رہے تھے اور دوسری طرف ان کے تدریسی اور تعلیمی ذوق کی یہ انتہا تھی کہ ان سات آٹھ بلکہ ان سے بھی خورد سال امیرزادوں کو وہ بقول بدایونی "تعلیم لفظ وخط ودائرہ بلکہ ابجد ہم می داد"..... اب خیال کیجیے کہ ملتان سے شیخ عبداللہ اور عزیز اللہ معقولات کا جو ذخیرہ لائے تھے گو سکندری حکومت کی سرپرستی انھیں بھی حاصل تھی اور اسی لیے جس حد تک ان علوم کو ان دونوں نے رواج دینا چاہا اس حد

Marfat.com

تک وہ مروج بھی ہو گئے لیکن ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ ہندوستان لائے اسے تو سلطنت کی صرف پشتیبانی ہی حاصل نہیں تھی، بلکہ حکومت کے اساطین و اراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچہ کو میر صاحب یہ شیرازی شراب پورے انہماک و توجہ سے پلا رہے تھے۔[۴۷] اس کا جو لازمی نتیجہ نکل سکتا تھا وہ نکلا۔ بقول مولانا غلام علی آزاد "معقولات را رواجے دیگر پیدا شد"۔ یہ تھا ہمارے نصاب تعلیم کا دوسرا انقلابی دور۔
شاہ ولی اللہ (م۔ ۱۷۶۲ء) اس دور کے آخری لیکن سب سے زیادہ نامور عالم تھے۔ انھوں نے الجزء اللطیف میں "اپنی درسیات" کی تفصیل اس ترتیب سے بیان کی ہے۔

۱۔ نحو : ۱۔ کافیہ ، ۲۔ شرح جامی۔

۲۔ منطق : ۱۔ شرح شمسیہ ، ۲۔ شرح مطالع۔

۳۔ فلسفہ : شرح ہدایت الحکمۃ[۴۸]

۴۔ کلام : ۱۔ شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی[۴۹] ، ۲۔ شرح مواقف۔

۵۔ فقہ : ۱۔ شرح وقایہ ، ۲۔ ہدایہ (کامل)۔

۶۔ اصول فقہ : ۱۔ حسامی[۵۰] ، ۲۔ توضیح[۵۱] وتلویح (کچھ حصہ)۔

۷۔ بلاغت : ۱۔ مختصر ، ۲۔ مطول۔

۸۔ ہیئت و حساب : بعض رسائل مختصرہ۔

۹۔ طب : موجز القانون[۵۲]۔

۱۰۔ حدیث : ۱۔ مشکوٰۃ المصابیح (کل) ، ۲۔ شمائل ترمذی[۵۳] (کل) ، ۳۔ صحیح بخاری[۵۴] (کچھ حصہ)۔

۱۱۔ تفسیر : ۱۔ مدارک ، ۲۔ بیضاوی۔

۱۲۔ تصوف و سلوک : ۱۔ عوارف المعارف ، ۲۔ رسائل نقشبندیہ ، ۳۔ شرح رباعیات جامی ، ۴۔ مقدمہ شرح لمعات ، ۵۔ مقدمہ نقد النصوص۔

تبصرہ : یہ فتح اللہ شیرازی کی توجہ، محنت اور ریاضت اور اکبر کے امین وزیر باتدبیر

Marfat.com

کی سرپرستی کا اثر تھا کہ اس دور کے نصاب میں پہلی مرتبہ فلسفہ، ہیئت وحساب اور طب اختیاری علوم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ عربی ادب کا مضمون خارج ہو گیا۔ نحو میں پانچ کی بجائے دو، کلام میں چار کی بجائے دو، اصول فقہ میں تین کی بجائے دو (حسامی کے اضافے کو شامل کر کے) اور تفسیر میں تین کی بجائے دو کتابیں رہ گئیں۔ منطق، فقہ اور بلاغت کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ حدیث کی کتب دو سے بڑھ کر تین ہو گئیں۔ مشارق الانوار کی جگہ شمائل ترمذی اور صحیح بخاری نے لے لی۔ تصوف میں چار کی بجائے پانچ کتابیں ہو گئیں۔ رسائل نقشبندیہ اور شرح رباعیات جامی کا اضافہ ہوا۔ عوارف المعارف بدستور قائم رہی۔ شرح لمعات اور نقد النصوص کے صرف "مقدمے" نصاب میں رکھے گئے۔ عقلیت کے فروغ نے تصوف کے رنگ کو پھیکا تو نہیں کیا لیکن اسے خالصتاً ایرانی رنگ ضرور دیا۔ سہروردی کے اشراقی سلسلے کے ساتھ ساتھ بہاؤالدین کے نقشبندی سلسلے کو رائج کیا۔ ابن عربی کی فصوص الحکم ایران پرستی کی نذر ہو گئی۔ دو کتابوں کے اضافے کے باوجود تصوف کا نصاب بڑھنے کی بجائے کم ہو گیا۔ سکندری دور کا نصاب دس علوم اور اٹھائیس کتب پر مشتمل تھا۔ اکبری دور میں اس میں تین علوم کا اضافہ تو ہوا لیکن کتابوں کی تعداد پچیس رہ گئی۔ جن میں دو کتابوں کے صرف "مقدمے" شامل تھے، ان کے متن نہیں۔

"شیرازی شراب" صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی کا مقدر نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مقدر تھی۔ اقبال کے نزدیک ایران ہماری قومی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر میں "جزو اعظم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا سب سے اہم واقعہ کون سا ہے تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب دوں گا کہ فتح ایران۔ معرکۂ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب سرزمین کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کر دیا جو سامی اور آریائی مسالے سے ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی تمدن سامی تفکر اور آریائی تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کی صلب سے ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گراں مایہ متاع ہاتھ آئی جو تسخیر یونان کے باعث اہل روما کے حصے میں آئی تھی۔ اگر ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل یک رخی رہتی"۔[۵۵]

دور چہارم کا نصاب: دور سوم کے آخری نامور عالم شاہ ولی اللہ (م۔ ۱۷۶۲ء) تھے۔ اس دور کا آغاز مشہور معقولی عالم میر فتح اللہ شیرازی (م۔ ۱۵۸۸ء) کی اکبر کے دربار میں آمد سے ہوا۔ ہندوستان میں اپنی تعلیم مکمل کر کے شاہ صاحب عرب تشریف لے گئے اور وہاں شیخ ابو طاہر مدنی سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ واپس آکر انھوں نے دہلی میں حدیث کا باقاعدہ درس دینا شروع کیا اور یہ ان کی اور ان کے خانوادے ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں "صحاح ستہ" کے درس و تدریس کا رواج ہوا۔ بہر حال نصاب میں ان کو لازمی کتب کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ علم کا مرکز اس زمانے میں دہلی سے لکھنؤ (فرنگی محل) منتقل ہو چکا تھا جہاں ملا نظام الدین (م۔ ۱۷۴۸ء) "منطق و حکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام و زباں" کو آشنا کر رہے تھے۔ ان ملا نظام الدین کی "تعلیم کا سررشتہ" چند واسطوں سے میر فتح اللہ شیرازی سے جا ملتا ہے۔

ہندوستان میں معقولات کا "رواج دیگر" میر فتح اللہ شیرازی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ اپنے علمی مذاق کو عام کرنے کے لیے انھوں نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کیے۔ بالخصوص "امیر زادگان حکومت" کے طبقے میں۔ "دربار کے امیروں کے بچوں کو وہ پابندی کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے اور اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو بجائے عوام کے اس ملک کے خواص اور امیر زادوں میں انھوں نے پھیلایا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات پر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے فارسی ادب کی نظم و نثر کا زیادہ اثر تھا۔ ان کا علمی مذاق دواوین و کلیات اور فارسی کے محاضرات و قصص و حکایات و تاریخی روایات کے مطالعے تک محدود تھا۔ ان کے درباروں میں علمی حیثیت سے اب تک اسی کا چرچا تھا لیکن میر فتح اللہ نے ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی ان امیروں کو لگا دیا"۔[۵۶]

عوام کا مذہب ہی ہوتا ہے جو خواص کا ہوتا ہے۔ میر فتح اللہ نے معقولات کا جو چسکا خواص کو لگایا تھا وہ رفتہ رفتہ عوام کو بھی لگ گیا۔ ہندوستان کے عام علمی خانوادے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بالخصوص درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین کا خانوادہ تعلیم کا مندرجہ بالا نظریہ انگلستان کی تاریخ میں تقاطر (INFLILTBRATION) کا نظریہ کہلاتا ہے جس کی رو سے عوام میں تعلیم کی اشاعت اور ان کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں تعلیم عام کر دی جائے۔ اس کے اثرات رفتہ رفتہ نچلے طبقے کو بھی سیراب کر دیں گے۔ انیسویں صدی کے انگلستان میں یہ نظریہ بہت مقبول تھا۔ سر سید احمد خاں (م۔ ۱۸۹۸ء) جب انگلستان گئے تو اس نظریے سے بے حد متاثر ہوئے۔ لندن سے واپس آکر (۱۸۷۰ء) انھوں نے اسی نظریے کے مطابق ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ مذکورہ بالا نظریے کا اصل موجد سولھویں صدی عیسوی میں ان کا اپنا ایک ہم وطن ہی تھا جس نے اس پر عمل کر کے ہندوستان میں معقولات کا مذاق عام کیا۔ دونوں نے تعلیم کی بنیاد ایک ہی نظریے پر رکھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فتح اللہ شیرازی نے اس کے ذریعے یونانی فلسفہ و حکمت کی تعلیم عام کی جب کہ سر سید نے اسے انگریزی اور سائنس کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے استعمال کیا۔

میر فتح اللہ شیرازی نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کر کے معقولات کے غلبے کی راہ کھولی۔ ان کے نامور شاگردوں میں سے ایک شاگرد مولانا عبدالسلام لاہوری تھے، "معدن عقلیات و نقلیات"۔ انھوں نے ساٹھ سال درس دیا اور "جمع کثیر" ان کے علم و فضل سے مستفید ہوا۔ ان کے شاگردوں میں سے جس شخص نے نمایاں حیثیت حاصل کی اس کا نام بھی عبدالسلام تھا۔ فرق یہ ہے کہ استاد عبدالسلام لاہور کے تھے اور شاگرد عبدالسلام اودھ کے مردم خیز قصبے دیوہ کے۔ عبدالسلام دیوی کے شاگردوں میں ملا دانیال چوراسی نے بڑا نام پایا جن سے ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید نے تعلیم حاصل کی۔ والد ماجد کی شہادت کی وجہ سے ملا نظام الدین (م۔ ۱۷۴۸ء)

Marfat.com

نے علوم متداولہ کی تحصیل حافظ امان اللہ بنارسی اور مولوی قطب الدین شمس آبادی سے کی یہ دونوں ان کے والد کے شاگرد تھے۔ اس علمی شجرے سے صاف ظاہر ہے کہ "درس نظامیہ" کے بانی ملا نظام الدین کا تعلیمی سلسلہ دراصل میر فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔ عقلیت کی جو لہر سکندر لودھی کے عہد (۱۴۸۹-۱۵۱۷ء) میں اٹھی تھی اور اکبری عہد (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) میں جس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی وہ عالمگیر کے عہد (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) میں "درس نظامیہ" کی شکل میں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔ یہ درس مندرجہ ذیل علوم اور کتب پر مشتمل تھا:

۱۔ صرف : ۱۔ میزان، ۲۔ منشعب[۵۸]، ۳۔ صرف میر[۵۹]، ۴۔ پنج گنج، ۵۔ زبدہ[۶۰]، ۶۔ فصول اکبری[۶۱]، ۷۔ شافیہ[۶۲]۔

۲۔ نحو : ۱۔ نحو میر[۶۳]، ۲۔ شرح مأۃ عامل[۶۴]، ۳۔ ہدایۃ النحو[۶۵]، ۴۔ کافیہ، ۵۔ شرح جامی۔

۳۔ منطق : ۱۔ صغریٰ[۶۶]، ۲۔ کبریٰ[۶۷]، ۳۔ ایساغوجی[۶۸]، ۴۔ تہذیب[۶۹]، ۵۔ شرح تہذیب[۷۰]، ۶۔ قطبی، ۷۔ میر قطبی[۷۱]، ۸۔ سلم العلوم[۷۲]۔

۴۔ حکمت : ۱۔ میبذی، ۲۔ صدرا[۷۳]، ۳۔ شمس بازغہ[۷۴]۔

۵۔ ریاضی : ۱۔ خلاصۃ الحساب[۷۵]، ۲۔ تحریر اقلیدس[۷۶] (مقالہ اول)، ۳۔ تشریح الافلاک[۷۷]، ۴۔ رسالۂ قوشجیہ[۷۸]، شرح چغمینی[۷۹] (باب اول)

۶۔ بلاغت: ۱۔ مختصر المعانی، ۲۔ مطول (تا ما انا قلت)۔

۷۔ فقہ : ۱۔ شرح وقایہ (اولین)، ۲۔ ہدایہ (آخرین)۔

۸۔ اصول فقہ: ۱۔ نور الانوار[۸۰]، ۲۔ توضیح، ۳۔ تلویح، ۴۔ مسلم الثبوت[۸۱] (مبادی کلامیہ)۔

۹۔ کلام : ۱۔ شرح عقائد نسفی، ۲۔ شرح عقائد جلالی[۸۲]،

Marfat.com

۳۔ میرزاہد[۸۳]، ۴۔ شرح مواقف۔

۱۰۔ **تفسیر**: ۱۔ جلالین[۸۴]، ۲۔ بیضاوی۔

۱۱۔ حدیث: مشکوٰۃ المصابیح۔

تبصرہ: گیارہ علوم اور تینتالیس کتب پر مشتمل اس نصاب میں معقولات کی کتابوں کی تعداد بیس تھی: منطق میں آٹھ، حکمت میں تین، کلام میں چار اور ریاضی میں پانچ۔ نصاب کا تقریباً نصف حصہ معقولات پر مشتمل تھا اور اس کی حیثیت لازمی تھی، اختیاری نہیں۔ اس کے بعد لسانیات کا درجہ تھا جس میں چودہ کتابیں شامل تھیں۔ صرف میں سات، نحو میں پانچ اور بلاغت میں دو۔ اس نصاب میں عربی ادب کی کوئی کتاب شامل نہیں تھی۔ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے۔ اس لیے صرف، نحو اور بلاغت کا شمار جتنا لسانیات میں ہے اتنا ہی معقولات میں۔ شرعیات پر کل نو کتابیں تھیں: فقہ پر دو (وہ بھی پوری نہیں پڑھائی جاتی تھیں)، اصول فقہ پر چار، تفسیر میں دو اور حدیث میں ایک۔ شرعیات میں کتابوں کی تعداد سب سے کم ہی نہیں تھی بلکہ کتابیں بھی مختصر ترین تھیں۔ دور اول، دوم اور سوم کے تینوں نصابوں میں تصوف کا درس شامل تھا۔ پہلے دو ادوار میں صحبت اور بیعت کے ذریعے عقائد میں پختگی اور کردار میں استواری پیدا کرنا تو ایک طرح فضیلت کا معیار تھا۔ علم حاصل کیا جاتا ہے عمل کے لیے اور تصوف کی تعلیم عمل کا موقع فراہم کرکے عقل کے مقابلے میں ذوق لطیف یا وجدان کی آبیاری کرتی ہے معقولات کا زبردست حامی ہونے کے باوجود میر فتح اللہ شیرازی نے، شاید ایرانی مذاق کے مطابق، تصوف کی تعلیم بدستور قائم رکھی۔ لیکن پانچ واسطوں سے ان کے ہندی شاگرد ملا نظام الدین نے عقلیت کے جوش میں اسے درس نظامیہ سے خارج کر دیا جو برصغیر پاک و ہند کی اس عظیم روایت کے بالکل منافی تھا جس کا سلسلہ حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش، خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت نظام الدین اولیا جیسے صوفیائے کرام نے شروع کیا تھا۔ اس فرو گذاشت پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ سلیمان سجادہ نشیں پھلواری

الندوہ کے ایک نمبر میں لکھتے ہیں: "اس درس کو ملا نظام الدین سے منسوب کرنا سراسر گستاخی ہے۔ ملا نظام الدین صوفی منش آدمی تھے۔ اگر وہ اسے درست تسلیم فرماتے تو تصوف اور اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے۔ حالانکہ اس درس نظامیہ میں تصوف و اخلاق کی ایک کتاب نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ درس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تصوف و اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔"[۱۵]

درس نظامیہ کی خصوصیات: تعلیم کی غایت ایک طرف ثقافتی سرمایہ نئی نسل کو منتقل کرنا ہے تو دوسری طرف فرد کی اپنی نشوونما کا اہتمام کرنا ہے معاشرے کی بقا اور ترقی ان دونوں مقاصد کے پورا ہونے پر منحصر ہے، آیئے اب دیکھیں کہ ملا نظام الدین کی انفرادی نشوونما سے کیا مراد ہے؟ انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ غور و فکر کی صلاحیت ہی اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور جملہ مخلوق کا تاجدار بناتی ہے، کیونکہ صرف وہی توحید کا مفہوم سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، پس قوت فکر کی نشوونما تعلیم کا اصل مقصود ہوئی، جس میں عقل نظری (جس کا تعلق منطق و فلسفے سے ہے) اور عقل استقرائی (جس کا تعلق طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات وغیرہ کے طبعی علوم اور تاریخ و اجتماعیات وغیرہ کے عمرانی علوم سے ہے) دونوں کی نشوونما شامل ہے قرآن نے ان دونوں مفہوموں میں ہمیں سوچنے، غور و فکر کرنے اور عقل سے کام لینے کی دعوت دی ہے: "اور اہل یقین کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور ان کے انفس میں بھی۔ تو پھر تم ان کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے۔"[۱۶] "جسے حکمت دی گئی۔ بے شک اسے خیر کثیر دی گئی۔"[۱۷] "بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات اور دن کے آنے جانے اور دریاؤں میں کشتیوں کے چلنے، جس میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں، اور بارش جو خدا تعالےٰ آسمان سے بھیجتا ہے جس سے مردہ زمین میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے، اور زمین میں ہر قسم کے مویشی پیدا کرنے اور ہواؤں کا رخ بدلنے اور بادل جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخر ہیں ــــ ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔"[۱۸] "ہم جلد ہی لوگوں کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں

134720

Marfat.com

گئے[۸۹] قرآن نے حقیقت کے اس پہلو کو جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بہت اہمیت دی ہے۔ اسی بنا پر اقبال کہتے ہیں کہ "اسلام کا ظہور عقل استقرائی کا ظہور ہے"[۹۰] قرآن کی رو سے تعلیم کی غایت عقل نظری اور عقل استقرائی دونوں کی نشوونما ہے۔ لیکن ملا نظام الدین نے اسے صرف عقل نظری کی نشوونما تک محدود رکھا، کیونکہ وہ خالصتاً عین پرست (IDEALIST) تھے اور ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصود تھا عقل فکر کی زبان میں توحید کے مفہوم کو سمجھنا جس میں نہ بصارت کا کوئی دخل ہو اور نہ بصیرت کا۔ شروع سے آخر تک انھوں نے صرف قوت فکر و فہم کی نشوونما پر زور دیا تاکہ کسی ایک کتاب کا مطالعہ کر کے اسی قسم کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے کی مطلوبہ استعداد پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا ابوالحسنات ندوی درس نظامیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتاتے ہیں کہ "طالب علموں میں امعان نظر اور قوت مطالعہ پیدا کرنے کا اس میں بہت لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور جس کسی نے تحقیق سے پڑھا ہو تو گو اس کو معاً بعد ختم تعلیم کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہو جاتا لیکن یہ صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ آئندہ محض اپنی محنت سے جس فن میں چاہے اچھی طرح کمال پیدا کرے"[۹۱] یہ تھا وہ فلسفہ جس پر درس نظامیہ کی بنیاد استوار کی گئی اور جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں: "اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کے پیش نظر تھی، یہ تھی کہ قوت مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے"[۹۲] یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ قرآن نے فطرت کو، خواہ وہ انفس میں ہو یا آفاق میں، خواہ اس کا تعلق بصیرت سے ہو یا بصارت سے، توحید کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ بتایا ہے، ملا نظام الدین نے نہ تو منطق و فلسفے کے ساتھ طبعیات و حیاتیات وغیرہ کے علوم درس میں شامل کیے، جیسا کہ قرطبہ اور غرناطہ کے مدارس میں رواج تھا، اور نہ ہی تصوف و اخلاق کی کوئی کتاب رکھی، جیسا کہ پچھلے تین ادوار کے نصاب میں اس کا اہتمام کیا گیا حالانکہ انھوں نے خود حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور نہ ہی تاریخ کو درخور اعتنا سمجھا، جسے قرآن نے "ایام اللہ"[۹۳] کہا ہے۔

Marfat.com

تعلیم کی غایت چونکہ صرف قوت فکر و فہم کی نشو و نما تھی، اس لیے درس نظامیہ کی ترتیب میں جن باتوں کو ملحوظ رکھا گیا وہ یہ ہیں:

۱۔ اس میں منطق و فلسفے پر سب سے زیادہ کتابیں رکھی گئیں، کیونکہ یہی وہ علوم ہیں جن سے ذہن تیز ہوتا ہے، حق و باطل میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ فکر کی ژولیدگی دور ہوتی ہے، تنقید و تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور قوت فہم کی نشو و نما ہوتی ہے۔ فلسفہ حقیقت اولیٰ کی ماہیت کا علم عطا کرتا ہے۔ منطق صحت فکر کے قوانین وضع کرتی ہے اور ہماری سوچ کو مغالطوں سے پاک کرتی ہے۔ ریاضی توجہ کو بھٹکنے سے روکتی ہے اور پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ کلام دینی عقائد کو عقلی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور حریت فکر کے شر سے انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ یہ سب علوم اپنے اپنے طریقوں سے عقل نظری کی تربیت کرتے ہیں تاکہ توحید کا صحیح نقش دل پر ثبت ہو۔

۲۔ ہر فن کی وہ کتابیں درس میں رکھی گئیں جن سے زیادہ مشکل کتاب اس فن میں نہ تھی جتنی مشکل کوئی کتاب ہوگی اتنی ہی زیادہ محنت اسے سمجھنے کے لیے کرنی پڑے گی اور اسی قدر فکر کی پرواز بلند ہوگی، نظر گہری ہوگی اور قوت فہم بڑھے گی۔

۳۔ جو مقصد مشکل و دقیق کتابیں پورا کرتی ہیں وہ مختصر کتابوں سے بھی پورا ہوتا ہے اس لیے ڈھونڈ کر ہر فن کی مختصر ترین کتاب نصاب میں شامل کی گئی۔ دقیق ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب اگر مختصر اور مجمل ہو تو قوت فکر کی اچھی طرح ورزش ہوتی ہے۔ اور جتنی زیادہ سخت ورزش ہوگی اتنی ہی زیادہ قوت فہم و فراست بڑھے گی۔

۴۔ اختصار کے اصول پر، جیسا کہ شبلی نے کہا ہے، اکثر کتابیں نا تمام درس میں رکھی گئیں۔ یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری خیال کیا گیا۔ مثلاً میر زاہد، صدرا، شمس بازغہ، مسلم الثبوت، تلویح، شرح وقایہ، ہدایہ، مطول، شرح چغمینی اور تحریر اقلیدس۔ ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل کیے گئے۔

۵۔ اختصار جہاں قوت فکر کو مہمیز کرتا ہے وہاں مدت تعلیم کو بھی کم کرتا ہے۔ ہر فن میں ایک دو مختصر اور نا تمام کتابیں ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ایک "متوسط الذہن طالب علم سولہ سترہ برس کی

Marfat.com

عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ علمائے فرنگی محل اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے تھے۔[۹۴]

۶۔ نصاب میں اصل زور چونکہ معقولی علوم پر ہے، اس لیے اس سے "وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہیں پیدا ہوتا جو سطحی فقہا کا خاصا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علما پیدا ہوئے ان میں کسی نے مذہبی مناظرے کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔"[۹۵]

۷۔ نصاب میں برصغیر پاک و ہند کے علما کی متعدد کتابیں شامل ہیں، مثلاً سلم العلوم، مسلم الثبوت، نور الانوار، شمس بازغہ، منشعب اور فصول اکبری، حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک کتاب بھی درس میں شامل نہیں تھی۔

۸۔ یہ نصاب عقل پرستی کے ساتھ ساتھ ملا نظام الدین کی "انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بھی مظہر ہے۔ علما میں یہ بات کم پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی علمی کاوشوں کو سراہیں، ان کی تبحر علمی کا اعتراف کریں۔ لیکن ملا نظام الدین نے اپنے معاصر علما کی اتنی عزت کی کہ ان کی کتابیں درس میں داخل کر دیں۔ نور الانوار، سلم العلوم اور مسلم الثبوت سب ان کے معاصرین کی کتابیں ہیں اور درس نظامیہ میں شامل ہیں۔" ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نصاب میں شامل نہیں کی، حالانکہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔[۹۶] درس نظامیہ کی پائیداری ان کے اسی اعلیٰ اخلاق کی رہین منت ہے۔

دورِ پنجم کا نصاب: درس نظامیہ ایک "خود رو نظام تعلیم ہے۔ اس کا ہیولیٰ فتح اللہ شیرازی نے تیار کیا اور صورت ملا نظام الدین نے بخشی جس پر بعد میں حسب ضرورت اضافہ ہوتا رہا۔ پہلا اضافہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے پر ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا اور اس طرح برصغیر پاک و ہند کے اسلامی مدارس میں درجہ فضل کا پانچواں نصاب رائج ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ **صرف:** ۱۔میزان، ۲۔منشعب، ۳۔صرف میر، ۴۔پنج گنج، ۵۔زبدہ، ۶۔دستور المبتدی[۹۷]، ۷۔فصول اکبری، ۸۔شافیہ،

Marfat.com

۹۔ علم الصیغہ[98]

۲۔ نحو : ۱۔ نحو میر ، ۲۔ مأة عامل[99] ، ۳۔ شرح مأة عامل ، ۴۔ ہدایۃ النحو ، ۵۔ کافیہ ، ۶۔ شرح جامی۔

۳۔ بلاغت : ۱۔ مختصر المعانی (کامل)، ۲۔ مطول (تاما انا قلت)۔

۴۔ ادب : ۱۔ نفحۃ الیمن[100] ، ۲۔ سبعہ معلقہ[101] ، ۳۔ دیوان متبنی[102] ، ۴۔ مقامات حریری ، ۵۔ حماسہ[103]۔

۵۔ فقہ : ۱۔ شرح وقایہ (اولین) ، ۲۔ ہدایہ (آخرین)۔

۶۔ اصول فقہ : ۱۔ نورالانوار ، ۲۔ توضیح ، ۳۔ تلویح ، ۴۔ مسلم الثبوت۔
یہ کتاب اصول فقہ میں ہے لیکن حصہ زیر درس دراصل علم کلام کا حصہ ہے۔

۷۔ منطق : ۱۔ صغریٰ ، ۲۔ کبریٰ ، ۳۔ ایساغوجی ، ۴۔ قال اقول[104] ، ۵۔ میزان منطق[105] ، ۶۔ تہذیب ، ۷۔ شرح تہذیب ، ۸۔ قطبی ، ۹۔ میر قطبی ، ۱۰۔ ملا حسن[106] ، ۱۱۔ حمد اللہ[107] ، ۱۲۔ قاضی مبارک[108] ، ۱۳۔ رسالہ میر زاہد ، ۱۴۔ حاشیہ غلام یحییٰ بر رسالہ میر زاہد[109] ، ۱۵۔ ملا جلال[110] کہیں کہیں مندرجہ ذیل کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ ۱۶۔ شرح سلم ملا مبین[111]۔ ۱۷۔ حاشیہ عبدالعلی بر رسالہ میر زاہد[112] ، ۱۸۔ شرح سلم بحر العلوم[113]۔

۸۔ حکمت : ۱۔ میبذی ، ۲۔ صدرا ، ۳۔ شمس بازغہ۔

۹۔ کلام : ۱۔ شرح عقائد نسفی ، ۲۔ خیالی ، ۳۔ میر زاہد امور عامہ۔

۱۰۔ ریاضی : ۱۔ تحریر اقلیدس (مقالہ اولیٰ) ، ۲۔ خلاصۃ الحساب ، ۳۔ تصریح[114] ، ۴۔ شرح تشریح ، ۵۔ شرح چغمنی۔

۱۱۔ فرائض : شریفیہ[115]۔

۱۲۔ مناظرہ : رشیدیہ[116]۔

Marfat.com

۱۳- تفسیر : ۱- جلالین، ۲- بیضاوی (تا سورۂ بقر)۔
۱۴- اصول حدیث : شرح نخبۃ الفکر[۱۱۷]
۱۵- حدیث : ۱- بخاری، ۲- مسلم[۱۱۸]، ۳- موطا[۱۱۹]، ۴- ترمذی[۱۲۰]،
۵- ابو داؤد[۱۲۱]، ۶- نسائی[۱۲۲]، ۷- ابن ماجہ[۱۲۳]۔

تبصرہ : پندرہ علوم اور اُنہتر کتب پر مشتمل اس نصاب میں منطق کی جتنی کتابیں شامل تھیں وہ عموماً ہر مدرسے میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس ادب و حدیث کی کتابیں ہر جگہ نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ جس طالب علم کو ادب کا مطالعہ کرنے کا شوق ہوتا وہ فارغ وقت میں ادب کی کتابیں پڑھتا تھا بشرطیکہ اسے کوئی معلّم ادب مل جائے جو اکثر مدارس میں نہیں ہوتے تھے۔ حدیث کے لیے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایسے مقامات کا سفر کرنا پڑتا تھا جہاں حدیث پڑھانے والے مل سکیں۔ اس لیے حدیث و ادب کی کتب کو مندرجہ بالا نصاب سے عملاً خارج ہی سمجھنا چاہیے۔

یہ نصاب ہندی مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا نصاب ہے۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے، تو وہ بنیادی امور کی بجائے سطحی امور اور اصول کی بجائے فروع پر زور دینے لگتی ہے۔ تعلیم کی اصل غایت توحید کے تصور کو دل میں بٹھانا ہے تاکہ انسان کی فکر، احساس اور ارادہ سب اس تصور کی تفسیر بن جائیں۔ قرآن اور حدیث عربی زبان میں ہیں، اس لیے توحید کے تصور کو دل نشین کرنے اور اس کے علمی مضمرات کو سمجھنے کے لیے عربی زبان، ادب اور قواعد کا جاننا از بس ضروری ہے۔ اسی طرح قوتِ فکر و فہم کی صحیح نشو و نما کے لیے منطق پڑھنا لازمی ہے۔ لیکن منطق کا مطالعہ اور زبان کا علم دونوں آلی علوم ہیں یعنی مقصود بالعرض جب کہ تفسیر و حدیث مقصود بالذات علوم ہیں۔ ایک کی حیثیت محض ذریعے اور آلے کی ہے، تو دوسرے کی اعلیٰ و ارفع مقصد کی جس کا حصول بہر حال آلی علوم کی تحصیل پر منحصر ہے۔ مندرجہ بالا نصاب میں علوم کی اس درجہ بندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس میں صَرف میں نو، نحو میں چھ، ادب میں پانچ اور بلاغت میں دو کتب شامل ہیں۔ لسانی علوم میں بائیس کتابیں رکھی گئیں اور معقولی علوم میں اُنتیس : منطق میں اٹھارہ، حکمت میں تین، کلام میں تین اور

ریاضی میں پانچ۔ اُنہتر کتب پر مشتمل اس نصاب میں اکیاون کتب آلی علوم پر ہیں، اور صرف اٹھارہ کتب شرعی علوم پر: تفسیر میں دو، حدیث میں سات، اصول تفسیر میں ایک، فرائض میں ایک، مناظرہ میں ایک، فقہ میں دو اور اصول فقہ میں چار۔ تفسیر میں بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے تھے۔ جلالین پڑھائی تو پوری جاتی تھی۔ لیکن اس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ قرآن مجید اور اس کے الفاظ و حروف عدداً برابر ہیں[۱۲۴]۔ حدیث کی سات کتابیں درس میں شامل تھیں لیکن ان کے پڑھانے کا کسی مدرسے میں انتظام نہیں تھا، جب کہ معقولات اور بالخصوص منطق پر ساری کی ساری کتابیں تقریباً ہر مدرسے میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس طرح عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ آلی علوم کی نذر ہو جاتا تھا اور تفسیر اور حدیث کے شرعی علوم کا تفوق اور بالادستی ختم ہو جاتی تھی۔

آلی علوم پر ضرورت سے زیادہ زور کے علاوہ اس نصاب میں ایسی کتابیں بھی شامل ہیں "جن میں متعدد فن مخلوط ہیں۔" اس خلط بحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور ما بعد الطبیعیات کے ہیں مثلاً علم باری، جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ۔ ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکے کی کتاب سمجھی جاتی ہے، لیکن جس قدر درس میں ہے اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے جو صرف اس خاص عبارت سے متعلق ہے جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے[۱۲۵]۔"

اس نصاب میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں "تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن وغیرہ ضروری علوم و فنون بالکل نہیں ہیں[۱۲۶]"، جن کی ثقافتی اہمیت اور معاشرتی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال بھی عربی مدارس میں دی جانے والی تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ "کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح اہل نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق و مذہب

Marfat.com

کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیئے۔[۱۲۷] مولانا عبدالمجید سالک کی رائے میں درس نظامیہ "قدیم ضروریات علمی کو تو پورا کرتا تھا لیکن اب اس میں معانی و بیان ، ادب و لغت ، طبیعیات، تاریخ ، جغرافیہ ، سیاسیات و اقتصادیات کے اضافے کی سخت ضرورت ہے ، جن کے علم کے بغیر کوئی شخص عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔[۱۲۸]

موجودہ دور کا نصاب : درس نظامیہ ، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ، "ایک خود رو نظام تعلیم ہے" ، جس میں وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود تبدیلی ہوتی رہتی ہے گذشتہ ڈھائی سو سال کے عرصے میں اس میں دو مرتبہ تبدیلیاں ہوئیں ۔ پہلی تبدیلی کی پوری تفصیل مولانا ابوالحسنات ندوی نے "دور پنجم" کے نصاب کے تحت بیان کی ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں ۔ یہ ۱۹۲۲ کی بات تھی ، تقسیم ہند سے پچیس سال پہلے کی بات ۔ آج ہمیں آزاد ہوئے پینتیس سال ہو چکے ہیں ۔ اس عرصے میں پہلے تبدیل شدہ نصاب میں بھی کافی تبدیلیاں آ گئیں ، کئی کتابیں درس سے خارج ہو گئیں ان کی جگہ نئی کتابیں آ گئیں ۔ اصول تفسیر اور عروض کے دو نئے علوم نصاب میں شامل ہوئے ۔ آج کل عربی مدارس میں درس نظامیہ کے نام سے جو نصاب رائج ہے وہ سترہ علوم اور چوراسی کتب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ **صرف :** ۱۔ میزان ، ۲۔ منشعب ، ۳۔ پنج گنج ، ۴۔ صرف میر ، ۵۔ علم الصیغہ ، ۶۔ فصول اکبری ، ۷۔ دستور المبتدی ، ۸۔ زرادی[۱۲۹] ، ۹۔ زنجانی[۱۳۰] ، ۱۰۔ صرف بہائی[۱۳۱] ، ۱۱۔ مراح الارواح[۱۳۲] ۔

۲۔ **نحو :** ۱۔ نحو میر ، ۲۔ نظم مأۃ عامل ، ۳۔ شرح مأۃ عامل ، ۴۔ ہدایۃ النحو ، ۵۔ کافیہ ، ۶۔ شرح جامی ، ۷۔ تسہیل الکافیہ[۱۳۳] ، ۸۔ حاشیہ شرح جامی[۱۳۴] ۔

Marfat.com

۳۔ منطق : ۱۔ صغریٰ ، ۲۔ کبریٰ ، ۳۔ ایساغوجی ، ۴۔ مرقات[۱۳۵]،
۵۔ تہذیب المنطق ، ۶۔ شرح تہذیب ، ۷۔ سلم العلوم
۸۔ شرح سلم العلوم حمد اللہ ، ۹۔ شرح سلم العلوم
قاضی مبارک ، ۱۰۔ شرح سلم العلوم ملا حسن لکھنوی ،
۱۱۔ رسالہ میر زاہد ، ۱۲۔ قطبی ، ۱۳۔ میر قطبی۔

۴۔ فلسفہ و حکمت : ۱۔ صدرا ، ۲۔ شمس البازغہ ، ۳۔ ہدیہ سعیدیہ[۱۳۶]،
۴۔ میبذی۔

۵،۶۔ ہیئت و ہندسہ : ۱۔ شرح چغمینی ، ۲۔ تحریر اقلیدس ، ۳۔ تصریح ،
۴۔ تشریح الافلاک ، ۵۔ خلاصۃ الحساب۔

۷۔ معانی و بیان : ۱۔ تلخیص المفتاح[۱۳۷]، ۲۔ مختصر المعانی ، ۳۔ مطول۔

۸۔ فقہ : ۱۔ خلاصہ کیدانی[۱۳۸]، ۲۔ منیۃ المصلی[۱۳۹]، ۳۔ نور الایضاح[۱۴۰]،
۴۔ قدوری[۱۴۱]، ۵۔ کنز الدقائق[۱۴۲]، ۶۔ شرح وقایہ ،
۷۔ ہدایہ ، ۸۔ سراجی[۱۴۳]۔

۹۔ اصول فقہ : ۱۔ حسامی ، ۲۔ توضیح ، ۳۔ تلویح ، ۴۔ اصول الشاشی[۱۴۴]،
۵۔ نور الانوار ، ۶۔ مسلم الثبوت۔

۱۰۔ کلام و عقائد : ۱۔ شرح مواقف ، ۲۔ شرح عقائد جلالی ،
۳۔ شرح عقائد نسفی ، ۴۔ خیالی۔

۱۱۔ تفسیر : ۱۔ انوار التنزیل و اسرار التاویل عرف بیضاوی ، ۲۔ جلالین ،
۳۔ کشاف۔

۱۲۔ اصول تفسیر : فوز الکبیر فی اصول التفسیر[۱۴۵]

۱۳۔ حدیث : ۱۔ مشکوٰۃ المصابیح ، ۲۔ صحیح البخاری ، ۳۔ صحیح المسلم ،
۴۔ جامع ترمذی ، ۵۔ سنن ابو داؤد ، ۶۔ سنن نسائی ،
۷۔ سنن ابن ماجہ ، ۸۔ شمائل ترمذی۔

Marfat.com

۱۴۔ اصول حدیث : نخبۃ الفکر۔

۱۵۔ مناظرہ : رشیدیہ

۱۶۔ ادب عربی : ۱۔ مفید الطالبین[۱۴۶]، ۲۔ نفحۃ الیمن، ۳۔ نفحۃ العرب[۱۴۷]،
۴۔ دیوان متبنی، ۵۔ دیوان حماسہ، ۶۔ مقامات حریری،
۷۔ سبعہ معلقہ۔

۱۷۔ عروض : عروض المفتاح[۱۴۸]۔

تبصرہ : اس رائج الوقت نصاب میں چوراسی میں سے اٹھائیس کتب مقصود بالذات علوم پر ہیں: فقہ میں آٹھ، اصول فقہ میں چھ، تفسیر میں تین، اصول تفسیر میں ایک، حدیث میں آٹھ، اصول حدیث میں ایک، مناظرہ میں ایک اور لسانیات اور معقولات کے آلی علوم پر چھپن کتب۔ لسانیات پر تیس اور معقولات پر چھبیس، جب کہ اس سے پہلے کے نصاب میں مقصود بالذات علوم پر صرف اٹھارہ کتابیں تھیں اور آلی علوم پر اکیاون، لسانیات پر بائیس اور معقولات پر انتیس۔ مقصود بالذات علوم کو بے شک اس نصاب میں زیادہ نمائندگی دی گئی ہے لیکن پھر بھی نصاب میں بہتات آلی علوم پر کتب کی ہے۔ بالخصوص شرح و حواشی کی جن کے انبار نے اسے بوجھل کر دیا ہے۔ مثلاً کلام و عقائد میں چار کتابوں میں سے تین شرح ہیں اور ایک حاشیہ۔ منطق میں سلم العلوم کی تین شرح اور شمسیہ کی دو شرح ہیں۔ نحو میں کافیہ کی ایک شرح ہے، ایک اس شرح پر حاشیہ ہے اور ایک اس کی فارسی شرح کا عربی ترجمہ ہے۔ یہ نصاب دراصل شرح و حواشی کا نصاب ہے جن کی بہار میں اصل کتابوں کا باغ اجڑ گیا ہے۔

قرآن نے وحی کے علاوہ تاریخ اور فطرت کو بھی علم کا ذریعہ بتایا ہے تاریخ کو اس نے "ایام اللہ" کا نام دیا ہے۔ اسی طرح فطرت یعنی انفس اور آفاق میں بھی اس نے اللہ کی نشانیاں دکھلانے کا وعدہ کیا ہے۔ قرآن کی اس واضح یاد دہانی کے باوجود درس نظامیہ کے کسی نصاب میں نہ تاریخ اور معاشیات و عمرانیات پڑھانے کا اہتمام کیا گیا۔ نہ اپنے

Marfat.com

من میں ڈوب کر راز زندگی پانے کی تربیت کے لیے تصوف و اخلاق کی کتب نصاب میں رکھی گئیں اور نہ مناظر قدرت میں صانع قدرت کا جلوہ دیکھنے کے لیے طبیعیات، نباتیات، حیوانیات اور بحریات وغیرہ کے طبعی علوم کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ "اسلام کا ظہور عقل استقرائی کا ظہور ہے"۔ درس نظامیہ کی تدوین کرنے والوں نے یونان سے برآمد کی ہوئی عقل نظری (THEORETICAL REASON) کی نشو و نما کو تعلیم کی اصل غایت قرار دے کر قرآن کی استقرائی روح کو پامال کیا۔ انھوں نے تعلیم کو صرف عقل نظری کی تربیت تک محدود رکھا۔ فکر و فہم کی نشو و نما کے لیے منطق و فلسفے کا بے حد اہتمام کیا، لیکن قوت مشاہدہ اور وجدان کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بصارت اور بصیرت دونوں سے ہمیں محروم رکھا جس کے مہلک نتائج آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں:

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ [۱۴۹]

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش [۱۵۰]

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہوں کہ دانائے نباتات [۱۵۱]

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ [۱۵۲]

علم عمل پر مقدم ہے۔ عمل کے نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم سوال علم کے ماخذ کا ہے، جس کا مختلف زمانوں میں مختلف جواب دیا گیا۔ قرون اولیٰ میں علم حق کا اصل ماخذ وحی الہٰی تھا جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ خدا صرف پیغمبروں پر وحی نازل کرتا ہے۔ بقیہ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ پیغمبروں پر ایمان لائیں اور ان کی تعلیم پر عمل کریں۔ یہ مذہب کی بالادستی کا زمانہ تھا۔ قرون وسطیٰ

میں علم کا عصا مذہب کے ہاتھ سے نکل کر فلسفے کے ہاتھ میں آگیا۔ وحی کی جگہ عقلی استدلال و استنباط نے لے لی۔ پہلے فہم و فراست کی شرط ایمان محکم تھا۔ اب شک شبہ فہم و فراست کا معیار بن گیا۔ یقینی علم کی کنجی مجرد تصورات پر غور و فکر کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سبھی نے وحی کے متن کو مجرد فلسفے کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کی، اپنے اپنے مذہب کو منطق اور فلسفے کی بنیادوں پر استوار کیا، ایمان کو عقل سے ہم آہنگ کیا اور اس طرح وہ فلسفہ وجود میں آیا جسے ہم آج کل مدرسی (SCHOLASTIC) فلسفہ کہتے ہیں۔ قرون اولیٰ میں علم حق پر مذہب کی اجارہ داری تھی، قرون وسطیٰ میں فلسفے کی۔ عصر حاضر کی روح نہ مذہب ہے نہ فلسفہ۔ اس کا خمیر سائنس سے تیار کیا گیا ہے جو صرف مشاہدے پر مبنی علم کو علم حق سمجھتی ہے۔ یہ علم بھی غور و فکر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن یہ غور و فکر مشاہدے یا تجربے سے حاصل شدہ مواد پر کیا جاتا ہے، مجرد تصورات پر نہیں قرون وسطیٰ میں عقل نظری کا راج تھا۔ عہد حاضر میں عقل استقرائی کا راج ہے جس نے خلا کو مسخر کر لیا ہے اور چاند پر جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔

نظریۂ علم اور تعلیم: تعلیم ہمیشہ نظریۂ علم کے تابع ہوتی ہے۔ قرون اولیٰ میں علم حق کا واحد ذریعہ وحی تھا۔ اس زمانے میں اسلامی تعلیم کا محور قرآن و حدیث تھا۔ صرف، نحو، ادب، لغت اور اشعار عرب کی جو تعلیم دی جاتی تھی وہ ان دو کی تعلیم کا ضمیمہ اور مقدمہ تھی۔ بعد میں تفسیر اور فقہ کے علوم کا اضافہ ہوا ۸۳۰ء میں خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا۔ اس دانش کدے میں ایک دارالترجمہ، ایک کتب خانہ اور ایک لیبارٹری بھی تھی جس میں سائنس کے تجربے کیے جاتے تھے۔ دارالترجمہ میں یونانی کتب کے ترجمے بڑے زور و شور کے ساتھ ہوئے۔ ان تراجم نے مسلمانوں کو یونانی منطق، فلسفے، ریاضی، ہیئت، ہندسہ اور طب وغیرہ کے علوم سے متعارف کرایا۔ نامور استاد اپنے اپنے گھروں میں ان علوم کی تعلیم دینے لگے۔ اس سے مذہبی عقائد اور اقدار کو جو نقصان پہنچا اس کے تدارک کے

Marfat.com

لئے اس زمانے کے علما نے بڑی وسیع القلبی سے کام لیا۔ اسلام کو ایک معقولی اور ترقی پسند دین کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے انھوں نے خود منطق پڑھی، فلسفہ پڑھا اور اجتہاد کا حق استعمال کر کے کلام کا ایک نیا علم ایجاد کیا جس کا مقصد مذہب کے لیے عقلی بنیاد فراہم کرنا تھا۔ اس طرح فلسفہ کلام کی صورت میں اسلامی نصاب میں داخل ہوا۔ قرون وسطیٰ کے علما نے عقلیت کے چیلنج کا مقابلہ عقلیت سے کیا۔ وہ خود منقولی سے معقولی بن گئے۔ خدا نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ عقل تھی۔ اس حدیث کی روشنی میں انھوں نے یہ تعلیم دینا شروع کی کہ جو شخص خدا کے قریب آنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ معقولی علوم پڑھے اس طرح مدارس عقلیات کا معدن بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دمشق، بغداد، عراق، مصر اور سپین کے مدارس کا معقولی نصاب غزنی، غور اور خراسان کے راستے لاہور، دہلی، آگرہ، اجمیر، لکھنؤ اور برصغیر پاک و ہند کے دوسرے شہروں میں پہنچا۔ یہاں عبداللہ تلمبی (م - ۱۵۱۶ء) میر فتح اللہ شیرازی (م - ۱۵۸۸ء) اور ملا نظام الدین (م - ۱۷۴۸ء) نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ فرنگی محل ہندوستان کا بغداد بن گیا۔

رفتہ رفتہ فلسفے کا بازار سرد پڑا اور سائنس کی پتنگ آسمان پر چڑھ گئی۔ علم حق پر اس کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ اس کایا پلٹ نے معاشرتی زندگی کی اساس کو یکسر بدل دیا۔ مذہبی عقائد و اقدار بھی اس کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ سائنس مذہب کے لیے ایک چیلنج بن گئی، جس طرح قرون وسطیٰ میں فلسفہ اس کے لیے ایک چیلنج بنا تھا۔ علما انبیا کے وارث ہیں۔ انھوں نے فلسفے کے چیلنج کا تو مؤثر جواب دیا لیکن سائنس کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے وہ میدان ہی میں نہیں اترے۔ اس کا ان پر حد درجہ منفی ردعمل ہوا۔ وسیع النظری چھوڑ کر انھوں نے تنگ نظری کو اپنا شعار بنا لیا۔ اجتہاد کے بجائے انھوں نے تقلید پر قناعت کر لی۔ حرکت کے بجائے جمود پر اکتفا کیا۔ انھوں نے سائنس کا مطالعہ

Marfat.com

کرکے جواباً علم کلام کی طرح کوئی نیا علم ایجاد نہیں کیا جو مذہب کو استقرائی بنیاد پر استوار کرتا اور خلا کی تسخیر اور چاند کی فتح کے اس دور میں اس کی بالادستی قائم رکھتا۔ قرآن کی واضح یاد دہانی کے باوجود انھوں نے مشاہدہ پر مبنی سائنس کو نصاب میں داخل نہیں کیا۔ درس نظامیہ میں دو مرتبہ ترمیم و تبدیلی ہوئی لیکن عمرانی اور طبعی علوم اس میں جگہ نہ پا سکے! ارسطو کی الٰہیات اور منطق اور فورفریوس (PORPHYRY) کا اس کی منطق پر مقدمہ جو ایساغوجی (ISAGOGE) کے نام سے مشہور ہے اگر درس نظامیہ کا لازمی جزو بن سکتے ہیں تو آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت، ہائزن برگ کا اصول عدم تعین جیمس جینیز اور رودجر اڈینگٹن کی مادہ گریز طبعیات اس کی زینت کیوں نہیں بن سکتیں۔ تسخیر قمر کی اس صدی میں ہمارے مدارس میں آج بھی قرون وسطیٰ کا معقولی نصاب پڑھایا جارہا ہے، حالانکہ نصاب میں اب زور نظری علوم کی بجائے استقرائی علوم پر ہونا چاہیے۔ درس نظامیہ نے وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیا اس لئے جدید عمرانی اور استقرائی علوم کی تعلیم کے لیے، جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے، الگ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ملک میں بیک وقت دو نظام تعلیم رائج ہوئے۔ ایک دینی نظام تعلیم اور دوسرا لادینی نظام تعلیم۔ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ اس کے باوجود ہم نے تعلیم کے شعبے میں اس تفریق کو عملی طور پر تسلیم کیا۔ اسلامی تعلیم سے اس انحراف کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ نظام تعلیم میں دوعملی نے من حیث القوم نہ ہمارے افکار میں وحدت پیدا ہونے دی اور نہ کردار میں۔ وحدت افکار اور وحدت کردار سے معرا یہ قوم "مسٹر" اور "مولانا" کے دو طبقوں میں بٹ گئی جس میں سے ہر طبقہ سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے دوسرے کا حریف ہے۔

باب سوم

طریق تعلیم

نصاب کو عموماً تدریسی مواد کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ دراصل صرف تدریسی مواد پر مشتمل نہیں، بلکہ اس کی وہ خاص تنظیم بھی ہے جسے طریق تدریس کہتے ہیں۔ طریق تدریس مواد کی تنظیم کا وہ طریقہ ہے جو استاد بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس مفہوم میں چونکہ وہ مواد کو پیش کرنے کا واحد ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے وہ مواد ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے گو شاگرد اس کے متعلق اس طرح نہیں سوچتا۔ اسلامی تعلیم کا محور توحید کا حیات پرور تصور ہے اور اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مضمرات۔ مواد چونکہ اپنی اصل میں ایک تصور ہے، اس لیے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنی سوچ کو اس پر مرکوز کرنے ہی سے اس کا صحیح علم اور فہم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی گہری سوچ شاگرد کی اپنی خود متحرکی پر منحصر ہے۔ بندہ اگر ایک قدم خدا کی طرف بڑھاتا ہے تو وہ دو بالشت بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہے۔ تعلیمی عمل ایک نہاں خانہ ہے جس میں طالب علم خود رہتا ہے استاد اس نہاں خانے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اپنے شخصی اثر و نفوذ کے ذریعے وہ چاروں طرف سے اس کا محاصرہ کر لیتا ہے۔ راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا ہے

Marfat.com

شاگرد میں اس طرح جو ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اسی پر اس کی اصل تعلیم منحصر ہے۔ یہ ردِ عمل جتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے اتنی ہی موثر اور کامیاب اس کی تعلیم ہوتی ہے۔ شاگرد خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ استاد صرف رہبری اور رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے۔ صحیح تدریسی مواد کے انتخاب اور اپنے ذاتی کردار کی مثال کے ذریعے وہ صرف دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے جس کے جواب میں شاگرد کی روح منزل کی طرف بڑھنے کے لیے خود بخود حرکت میں آتی ہے۔ اس اصول کے مطابق برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس میں تعلیم کا جو طریقہ رائج ہوا وہ مطالعے، درس، مباحثے، اعادے اور پڑھانے کی مشق کے پانچ ارکان پر مشتمل تھا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مطالعہ: خود متحرکی پر مبنی اس تعلیم کا پہلا اصول مطالعے کا اصول تھا۔ شاگرد کے لیے ضروری تھا کہ وہ درس سے پہلے خود کتاب کا بنظرِ غائر مطالعہ کرے۔ اپنی قوتِ فکر کو حرکت میں لائے اور کتاب کی عبارت کو سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ بقول شمس الدین یحییٰ بن یحییٰ، صاحب سیر الاولیا "شبہات و قیود" کی "تحقیق" کرے "شبہات و قیود" کی اس "تحقیق" کا نام مطالعہ تھا۔ "مسئلے کے بیان کرنے میں مصنف کتاب نے جو طریقۂ بیان اختیار کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا، اس پر جو اعتراضات ہو سکتے ہوں ان کو پیدا کرنا۔ اسی کا نام "شبہات" تھا۔ بیان کس قدر جامع و مانع ہے اس کو جانچنا۔ اس کے لیے جن قیود اور شرائط کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ان کو پرکھنا۔ کتاب کی عبارت کے سوا خود مسئلے میں جو پیچیدگیاں ہوں ان کو خود سلجھانا، جو نہ سلجھ سکتی ہوں انھیں استاد کے سامنے پیش کرنا۔ الغرض خود مسئلے پر اور جس عبارت کے ذریعے مسئلہ ادا کیا گیا ہے، اس پر اپنی اپنی حد تک حاوی ہونے کی کوشش کرنا۔ اس کوشش میں جو نقص رہ جائے استاد سے روزانہ اس کے متعلق دریافت کرنا[۱۵۳]"

مفتی رکن الدین نے مولانا انوار اللہ خاں حیدرآبادی کی سوانح عمری مطلع الانوار،

Marfat.com

یں طالب علمی کے زمانے میں ان کے مطالعے کا طریقہ خود ان کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے :

"ہم کوشش کرتے تھے کہ مضمون کسی صورت سے مطالعے میں حل ہو جائے۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت و ترجمے کی جانب توجہ کی جاتی تھی۔ جو نئے الفاظ آتے تھے ان کو لغت کی مدد سے حل کیا جاتا۔ پھر مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر ایک دفعہ مضمون حل نہ ہوتا تو دوبارہ سہ بارہ سعی کی جاتی۔ اگر کوئی اتنا ہی مشکل مضمون ہوتا جو سعی پیہم کے باوجود سمجھ میں نہ آتا تو دل میں ایک خلش رہتی۔ جب استاد (مولانا عبدالحئی فرنگی محلی) کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز شبہات کے جو مطالعے میں حل نہ ہو سکے ہوں اور کوئی بات دریافت طلب نہ رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کئی صفحے درس ہوتا تھا۔"

مطالعے کے سلسلے میں صرف لغت سے استفادہ کرنے کی اجازت تھی۔ طلبا کو سختی سے پابند کیا جاتا تھا کہ "مطالعے کے وقت وہ کسی تشریحی نوٹ یا حواشی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ کسی طالب علم کے متعلق اگر استادوں کو محسوس ہو جاتا کہ یہ مطالعے کے وقت حاشیہ وغیرہ دیکھنے کا عادی ہے تو اس سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا۔"[۱۰۱] یہ تھا مطالعے کا وہ طریقہ جس کے ذریعے قوت فکر و فہم کی نشو و نما کی جاتی تھی اور جسے تعلیم کا اصل مقصود سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ درس : تعلیمی عمل کا دوسرا رکن درس تھا۔ جس طرح مطالعہ شاگرد کے علمی ذوق اور اس کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش پر مشتمل تھا، اسی طرح درس استاد کے تبحر علمی اور شاگرد پر اس کے ہمہ گیر اثر کا مظہر تھا۔ استاد کی "قدر و منزلت"، بقول مولانا انوار اللہ خان، اس بات سے معلوم ہوتی تھی کہ "جو مضمون گھنٹوں میں حل نہ ہو سکا تھا استاذ نے ذرا سی دیر میں حل کر دیا۔" طلبا پر اس کا جو اثر ہوتا تھا اس کا تو کیا ہی کہنا۔ "جب استاذ سے مطلب معلوم ہوتا تھا تو فرط مسرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے بیش قیمت خزانہ مل گیا۔" یہی وجہ تھی کہ دور دراز کا سفر کر کے لوگ نامور

Marfat.com

علماء کے درس میں شریک ہوتے تھے اور مدرسے سے منسوب ہونے کے بجائے اس ذات گرامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے تھے جس سے انھوں نے تعلیم پائی تھی۔

قدیم زمانے میں کالج کا تصور آج کل کے کالج کے تصور سے مختلف تھا: ایک شاندار عظیم الشان عمارت، ماہران فن کا ایک گروہ، لکچروں کا ایک سلسلہ، چند محدود گھنٹے (جس کے بعد وہ عمارت قالب بے جان رہ جاتی ہے) — یہ چیزیں یکجا ہو جائیں تو یہ ایک یونیورسٹی یا کالج ہے۔ لیکن قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود کا نام تھا۔ وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا، اس کے گرد مستفیدوں کی ایک جماعت کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا۔ دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا۔ اس کے حرکات و سکنات، نشست و برخاست، وضع و قطع، طور طریقے، سب خاموش علمی لکچر تھے۔ شاگردوں کا سلسلہ در سلسلہ پھیلتا جاتا تھا، یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج، یونیورسٹی یا جامعۂ اعظم بن جاتا تھا۔ آج لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں مثلاً آکسن، لیکن اس زمانے میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے۔ اس قسم کے "زندہ کالج" ہندوستان کے گوشے گوشے میں موجود تھے لیکن اودھ کا صوبہ نسبتاً دوسرے صوبوں سے ممتاز تھا۔ دہلی اور لکھنؤ پائے تخت تھے لیکن علمی فیض رسانی میں سہالی، دیوا، گوپامئو، بلگرام جیسے دیہات ان دارالسلطنتوں سے بجا طور پر ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

ایسے ایک شخص پر مشتمل "زندہ کالج" کو قدیم اصطلاح میں "حلقہ" کہتے تھے جو بقول مہدی نختیں "دنیائے اسلام کا ایک منفرد تعلیمی تجربہ" ہے۔ حلقے کی تشکیل جس طرح کی جاتی تھی اس کا طریقہ یہ تھا۔ استاد کسی چوکی، چبوترے یا منبر پر بیٹھتا تھا جو عام طور پر کسی دیوار یا ستون سے ملحق ہوتا تھا۔ طلبا نصف دائرے میں اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ حلقہ شاگردوں کی انفرادی استعداد کے مطابق بنایا جاتا تھا۔ ذہین ترین طلبا کو استاد کے قریب جگہ ملتی تھی جو نصف دائرے کے ایک سرے پر ہوتے تھے، جب کہ دوسرے سرے پر حلقے کے کمزور طلبا بیٹھتے تھے۔ اس طرح استاد حلقے کے ذہین اور کمزور دونوں قسم

Marfat.com

کے طلبا پر نظر رکھتا تھا۔ حلقے میں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے ایک خاص جگہ ہوتی تھی جنہیں حسب دستور سوال کرنے کا حق ہوتا تھا"[۵۶]

اس قسم کے حلقے میں بیٹھ کر استاد درس دیتا تھا۔ ابتدا میں درس میں املا کا طریقہ استعمال ہوتا تھا جسے اردو میں لکھ دینا کہتے ہیں۔ استاد "کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب العلم، جو ہمیشہ دوات و قلم لے کے بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔۔۔۔۔ جب معمول سے زیادہ طلبا حلقۂ درس میں جمع ہو جاتے تھے تو استاد کے سامنے یا دائیں یا بائیں چند فاضل کھڑے ہو کر دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سناتے تھے۔ یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے۔"[۵۷] عثمانی عہد میں املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ آٹھویں صدی میں حافظ زید الدین عراقی (حافظ ابن حجر کے استاد) نے اس کو زندہ کرنا چاہا اور تقریباً چار سو مجلسوں میں اسی طرح درس بھی دیا۔ حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی ان کی تقلید کی، مگر انہی بزرگوں پر خاتمہ ہو گیا۔ جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا، لیکن لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر خود باز رہے"[۵۸]

املا کا طریقہ چونکہ متروک ہو گیا تھا، اس لیے برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس میں درس کا جو طریقہ رائج ہوا وہ "قرأت" کا طریقہ تھا۔ استاد کتاب کی "قرأت" کرتا تھا اور طلبا اسے غور سے سنتے تھے۔ بعض اوقات طالب علم "قرأت" کرتا تھا اور استاد سنتا تھا اور تلفظ کی غلطیوں کی تصحیح کرتا جاتا تھا۔ "قرأت" کے دوران میں طلبا اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے، جو مطالعے کے وقت ان کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے، سوال بھی کرتے رہتے تھے۔ "روزانہ کئی صفحے درس ہوتا تھا۔ کیونکہ جب استاد کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز شبہات کے جو مطالعے میں حل نہ ہو سکے ہوں اور کوئی بات دریافت طلب نہ رہتی"

۳۔ مباحثہ: قدیم درس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ "گونگا درس" نہ تھا۔ یعنی ایسا درس جس میں استاد بولے اور شاگرد کان لگا کر خاموشی سے صرف سنے یا لکھے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے

Marfat.com

اس لیے سوال کرنا فرداً فرداً ہر طالب علم کے لیے لازم تھا۔ اگر کوئی طالب علم چند دن بھی چپ رہتا تو استاد فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتا اور اسے سوال کرنے پر مجبور کرتا اور اس طرح درس "بحث و تحقیق" کی ایک محفل بن جاتا جس میں ہر طالب علم بڑی سرگرمی سے حصہ لیتا۔ سوال کرنے کا حق اتنی فیاضی سے طلبا کو دیا جاتا کہ اکثر تین تین دن تک شاگرد اور استاد ایک ہی مسئلے پر الجھے رہتے، سوال و جواب ہوتے رہتے۔ "مفادضہ و محاورہ" کی مجلس جمی رہتی۔ استاد کے سامنے "بحث و تحقیق" کی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لیے طلبا کو مطالعے میں کافی کاوش و محنت کرنی پڑتی تھی، کیونکہ جماعت میں امتیاز کا سارا دار و مدار ہی اسی پر تھا۔ اکثر طلبا رات گئے تک مطالعے میں مصروف رہتے۔ مباحثے کی فکر انھیں سونے نہ دیتی۔ "مطالعہ اور مباحثہ" طالب علم کے دو ضروری جزو تھے۔ طلبا مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں، اساتذہ اس کی باقاعدہ نگرانی کرتے تھے اور اس کا پتا "طریق بحث" سے چل جاتا تھا۔ سوال و جواب جو اساتذہ اور طلبا کے درمیان ہوتے تھے ان سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون طالب علم درس کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آیا ہے اور کون بغیر کسی تیاری کے آکر بیٹھ گیا ہے۔ گویا مباحثہ مطالعے کا امتحان تھا۔ جس طرح ابتدائی تعلیم میں جو زیادہ تر حافظے کی تربیت پر مشتمل تھی، اصل زور "آموختہ" پڑھنے پر تھا کیونکہ یہی اس عمر میں بہترین طریق آموزش ہے اور امتحان آموزش بھی، اسی طرح اعلیٰ تعلیم میں، جس کا مقصد قوت فکر کی نشو و نما تھا، سارا زور مباحثے پر تھا۔ جو بیک وقت طریق آموزش ہے اور امتحان آموزش بھی۔ اس سے ایک طرف شاگرد میں خود سوچنے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بڑھتی ہے جس کے بغیر کسی فن میں مہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے الفاظ میں مباحثہ شاگرد کی خود متحرکی کے مدارج ترقی کا مقیاس تھا۔ اس سے استاد کو شاگرد کی قابلیت اور علمی استعداد کا پتا چلتا رہتا تھا۔ "سوالات میں گہرائی اور شکوک و شبہات میں قوت جتنی بڑھتی جاتی تھی یہ سمجھا

Marfat.com

جاتا تھا کہ اسی حد تک وہ علم میں ترقی کر رہا ہے[۱۵۹] "، اور اس کے سوچنے کی صلاحیت بڑھ رہی ہے۔

۴۔ **اعادہ یا تکرار** : قدیم درس کی ایک اور خصوصیت سبق کو دہرانے کا اہتمام تھا جسے پہلے اعادہ کہتے تھے لیکن بعد میں جس کا نام تکرار پڑ گیا۔" اس زمانے میں نامور علما کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تھے تو شاگردوں میں سے جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا۔ یہ منصب جسے حاصل ہوتا تھا اسے معید کہتے تھے[۱۶۰] ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اعادے کے اس دستور کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:" اور اس (استاد) کے دائیں اور بائیں دو معید بیٹھتے ہیں جو ان لکچروں کو دہراتے ہیں جسے استاد شاگردوں کو دیتا ہے۔" اعادے کے اس دستور کے دو فائدے تھے۔ طالب علم اگر سبق کا کوئی حصہ بھول جاتا تو اس سے یہ کمی پوری ہو جاتی۔ اس کے علاوہ درس کے جو نقوش ذہن پر ثبت ہوتے وہ اس طرح اور واضح اور گہرے ہو جاتے۔ کمزور اور ذہین طلبا دونوں اس سے یکساں طور پر مستفید ہوتے اور ان کی قوت فکر و فہم و حفظ کو تقویت ملتی۔

۵ ۔ **پڑھانے کی مشق** : قدیم مدارس میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ اعلیٰ جماعتوں کے طلباء طالب علمی ہی کے دنوں میں اس بات کی کوشش کرتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت کے طلبا کو پڑھاتے رہیں خصوصاً وہ طلبا جو استاد بننے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نفع المفتی والسائل میں لکھتے ہیں:"جس کتاب کے پڑھنے سے میں فارغ ہوتا، اسی کو پڑھانا بھی شروع کر دیتا۔" اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ "تمام علوم میں میری لیاقت پختہ ہوتی چلی گئی۔ ..... مجھے کسی کتاب کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، خواہ کون سی بھی کتاب ہو اور کسی فن کی ہو۔ حتیٰ کہ اس مشق کی بنیاد پر ایسی کتابوں کو میں نے پڑھا دیا۔ جنھیں

Marfat.com

استاد کے سامنے یں نے نہیں پڑھا تھا مثلاً طوسی کی شرح اشارات اور افق المبین، طب میں قانون شیخ، عروض کا رسالہ۔

طالب علمی کے زمانے میں درس و تدریس کے اس شغل کے بڑے فائدے تھے۔ کسی کتاب کو خود سمجھنا اور بات ہے اور دوسرے کو سمجھانا اور بات۔ سمجھنا اپنی قوت فکر و فہم کو حرکت میں لانا ہے۔ سمجھانا اس کے ماحصل کو مناسب الفاظ کے ذریعے دوسرے کے ذہن میں اس طرح منتقل کرنا ہے کہ اس کی قوت فکر و فہم حرکت میں آجائے اور وہ الفاظ میں مضمر معانی کے خزانے کو پالے۔ سمجھانا باقاعدہ ایک فن ہے، جس طرح سمجھنا خود ایک فن ہے۔ سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ سمجھانے والے کو خود نفسِ مضمون پر عبور حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ اسے زبان پر بھی قدرت حاصل ہو تاکہ وہ اپنے مخاطب کی ذہنی استعداد کے مطابق اس سے کلام کر سکے۔ خود پڑھتے وقت انسان اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا جتنی ذمہ داری دوسرے کو پڑھاتے وقت خود بخود اس پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس احساس ذمہ داری سے ایک طرف اس کے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کی قوت اظہار کو چار چاند لگتے ہیں، جنھیں کسی بھی نظام تعلیم میں استاد کی قابلیت اور لیاقت کو جانچنے کا واحد معیار سمجھا جاتا ہے۔

اعلیٰ جماعت کے طلبا، نچلی جماعت کے طلبا کو پڑھانے کا کام اپنا علمی شوق پورا کرنے کے لیے کرتے تھے، اس لیے ان کا حال ٹیوشن پڑھانے والے پیشہ ور طلبا کا نہ تھا۔ اس سے نچلی جماعت کے طلبا کو فائدہ تو پہنچتا ہی تھا، خود اعلیٰ جماعت کے طلبا کو بھی بے حد فائدہ ہوتا تھا۔ ان میں پڑھانے کی بیش بہا قابلیت اور لیاقت پیدا ہو جاتی تھی۔ فن تدریس میں ملکہ حاصل ہوتا تھا۔ پہلے زمانے کا ہر مدرسہ بیک وقت ایک عمومی تعلیمی ادارہ تھا اور اساتذہ کی تربیت کا ایک خصوصی ادارہ بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے لوگوں کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد استاد بننے کے لیے علیحدہ سے تدریس کی کسی باضابطہ تربیت کی سند کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

Marfat.com

۶۔ **بیعت و صحبت:** یہ تھے قدیم طریق تعلیم کے پانچ بنیادی اصول جس کا واحد مقصد کتاب میں مضمر توحید کے تصور اور اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مضمرات کو اچھی طرح ذہن میں بٹھانا تھا۔ لیکن اس زمانے میں توحید کے تصور کو صرف ذہن میں بٹھانا کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ذہن میں بٹھانے کے بعد اسے دل میں بٹھانے کا بھی زبردست اہتمام کیا جاتا تھا۔ ذہن کی تربیت کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت بھی قدیم نظام تعلیم کا ایک لازمی جزو تھی۔ قلب کی اس باضابطہ تربیت کا اصطلاحی نام "پیری مریدی یا بیعت و صحبت" تھا۔ اور یہی چیز قدیم تعلیم کا اختتامی جزو تھی۔ مدرسوں میں دماغوں کی آبیاری کی جاتی تھی اور ان سے ملحق خانقاہوں میں دلوں کی تربیت کی جاتی تھی۔ دل کی تربیت حاصل کرنے والوں کا اصطلاحی نام صوفی اور ان کے علمی و عملی مشاغل کا نام تصوف تھا۔ ذہن کی رسمی تربیت سے فارغ ہو کر اکثر لوگ پیران طریقت کی صحبت و نگرانی میں زندگی کا کچھ حصہ گزارتے تھے۔" ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کرسکیں گے جس نے مدرسے سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو۔[۱۶]

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قدما نے "کتاب و حکمت" کی تعلیم کا نہایت ہی مناسب اور معقول انتظام کیا۔ نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے "انفس" میں خدا کی نشانیاں ڈھونڈنے کا بھی زبردست اہتمام کیا۔ اپنے من میں ڈوب کر راز زندگی پانے کے لیے مدرسوں کے علاوہ خانقاہیں بھی تعمیر کیں۔ قوت فکر و وجدان کی نشوونما میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن "آفاق" میں خدا کی نشانیاں ڈھونڈنے کا انھوں نے کوئی اہتمام نہ کیا۔ قوت مشاہدہ کی تربیت کے لیے تجربہ گاہیں قائم کرنے کی طرف انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وجدانی علوم کی طرح انھوں نے استقرائی علوم کو درخور اعتنا نہ سمجھا، حالانکہ خدا نے "نفس" کی طرح "آفاق" میں بھی اپنی نشانیاں دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ قرآن نے جہاں مشاہدۂ باطن پر زور دیا ہے، وہاں فطرت کا مشاہدہ کرنے کی بھی بار بار

Marfat.com

تاکید کی ہے۔ لیکن ہم اندرون بینی میں ایسے کھو گئے کہ بیروں بینی کا ہوش نہ رہا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ اس برصغیر میں جہاں خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاؤالدین زکریا اور شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے بزرگ صوفیائے کرام پیدا ہوئے، وہاں ابن سینا، ابن ہیثم اور جابر ابن حیان جیسے سائنس دان پیدا نہ ہوتے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر زبید احمد "عربی ادبیات میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ"، مترجم شاہد حسین رزاقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳، ص ۹ (بحوالہ ابن سعد، ہفتم ۲، ص ۳۶) اور ص ۶۵۔

۲۔ عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں"، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، س۔ ن، ص ۱۸۶۔

۳۔ ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور ص ۱۱۔

۴۔ ای۔ ڈی۔ میرز، "ایجوکیشن ان دی پرس پیکٹو آف ہسٹری"، لانگ مینز، لندن، ۱۹۶۳، ص ۱۹۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۶۔ فلپ حتی، "دی ہسٹری آف دی عربز"، میکملن اینڈ کمپنی، لندن، ۱۹۵۳، ص ۴۱۰۔

۷۔ ای۔ ڈی۔ میرز، کتاب مذکور، ص ۲۰۴

۸۔ مناظر احسن گیلانی، "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"، جلد اول، دہلی، ۱۹۴۴، ص ۳۱۷۔

۹۔ ای۔ بی۔ ٹائلر، "پری مٹو کلچر"، لندن، ۱۹۲۹، ص ۱۔

۱۰۔ بحوالہ ابوالحسنات ندوی، "ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں"، امرت سر، ۱۹۲۲، ص ۹۴۔

Marfat.com

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۱۲۔ ۱۹۲۶ میں عبد السلام ندوی کی کتاب "التربیت الاستقلالیہ" جو علی گڑھ سے شائع ہوئی، اس میں "تعلیم قدیم وجدید کی خرابیاں" کے عنوان سے نوے صفحے کا ایک طویل مقدمہ ہے۔ پانچ ادوار کے درجۂ فضل کے نصاب کی الگ الگ تفصیل اور اس پر تنقید ہے۔ مقدمے کا یہ حصہ ابوالحسنات ندوی کی کتاب "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" میں سے ہو بہو نقل کر دیا گیا ہے لیکن اس امر کا اعتراف مصنف نے کہیں نہیں کیا ہے۔

۱۳۔ ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور، ص ص ۹۵ - ۹۶ -

۱۴۔ یہ ابوبکر عبد القادر بن عبد الرحمٰن جرجانی کی تصنیف ہے۔ دیکھیے مفتی انتظام اللہ شہابی، "اسلامی نظام تعلیم کا چودہ سو سالہ مرقع"، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۴۶۔

۱۵۔ عربی نحو کی اس مختصر اور معتبر کتاب کا مصنف جمال الدین ابوعمرو عثمان ابن عمر بن ابوبکر بن یونس ہے جو ابن حاجب کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے والد کرد قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور امیر عزالدین موسک الصلاحی کے حاجب تھے۔ اس نسبت سے وہ ابن حاجب کہلائے۔ ان کی ولادت ۱۱۷۵ء میں مصر کے ایک گاؤں "فنا" میں ہوئی اور وفات ۱۲۴۹ء میں سکندریہ میں ہوئی۔ انھوں نے فقہ اور عروض پر بھی کتابیں لکھی ہیں لیکن نحوی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ"، جلد اول، ۱۹۶۴، ص ص ۴۷۵ - ۴۷۶)

۱۶۔ اس کتاب کا پورا نام "لب الالباب فی علم الاعراب" ہے۔ اس کے مصنف عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی ابوالخیر ناصر الدین مضافات شیراز کی ایک بستی بیضا میں پیدا ہوئے اور اس نسبت سے البیضاوی کہلائے۔ شافعی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ شیراز کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ۱۲۸۶ء میں تبریز میں وفات پائی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، جلد پنجم، ۱۹۷۱، ص ص ۲۸۶ - ۸۸)

۱۷۔ یہ کتاب شہاب الدین دولت آبادی کی تصنیف ہے۔ وہ چودھویں صدی عیسوی

Marfat.com

کے آخری نصف میں دولت آباد دکن میں پیدا ہوئے اور ۱۴۴۵ء میں وفات پائی۔ جب امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ جون پور چلے گئے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے ان کی بہت عزت افزائی کی جون پور کا قاضی بنادیا اور ملک العلما کا خطاب دیا۔ "الارشاد" یا ارشاد النحو" عربی نحو پر ان کی مشہور کتاب ہے۔ بعض کے نزدیک ابن حاجب کے کافیہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۹۸)۔

۱۸۔ یہ کتاب علامہ برہان الدین مرغینانی کی کتاب "بدایت المبتدی" کی متوسط شرح ہے جو موصوف نے خود لکھی ہے اور حنفی فقہ کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہملٹن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ۱۷۹۱ء میں لندن سے شائع ہوا۔ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل بن خلیل بن ابی بکر ۱۱۱۷ء میں فرغانہ کے ایک شہر مرغینان میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے مرغینانی کہلائے۔ ۱۱۹۷ء میں سمرقند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (اختر راہی، "تذکرہ مصنفین درس نظامی"، لاہور، ۱۹۷۸، ص ص ۴۷ ــ ۵۷)

۱۹۔ یہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی (م۔ ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) کی تصنیف ہے جس کی ایک شرح احمد بن ابوسعید ملا جیون (م۔ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء) نے "نور الانوار" کے نام سے لکھی۔

۲۰۔ اس کا دوسرا نام" اصول فخر الاسلام" ہے۔ اس کے مصنف علامہ علی ابوالحسن البزدوی پانچویں صدی ہجری کے مشہور اصولی تھے۔

۲۱۔ اس کا پورا نام "مدارک التنزیل" ہے۔ یہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی کی تصنیف ہے۔ (مفتی انتظام اللہ شہابی، کتاب مذکور، ص ۴۶)۔

۲۲۔ یہ لب الالباب کے مصنف عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی ابوالخیر ناصر الدین البیضاوی (م۔ ۱۲۸۶ء) کی مشہور تفسیر ہے۔ اس کا اصل نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے جو جار اللہ زمخشری کی تفسیر الکشاف کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے۔ زمخشری پر معتزلی نظریات کا رنگ چڑھا ہوا ہے جس کی اصلاح کرنے کی کوشش

Marfat.com

میں بیضاوی نے بعض اوقات انھیں مسترد اور بعض اوقات حذف کر دیا ہے۔
بعض جگہ ان تصورات کو غالباً نظر انداز کرتے ہوئے جوں کا توں رہنے دیا۔
(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد پنجم، ۱۹۷۱، ص ص ۲۸۶ - ۲۸۸)

۲۳۔ اس کا پورا نام الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل ہے۔
اس کے مصنف ابوالقاسم محمود بن عمر جاراللہ زمخشری خوارزم کی ایک بستی زمخشر
میں ۴۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ۵۳۸ھ میں جرجانیہ میں وفات پائی۔ عقیدے کے
اعتبار سے متشدد معتزلی تھے۔ کشاف کی تالیف ۵۲۶ھ میں خانۂ کعبہ کے جوار
میں شروع کی جو ۵۲۸ھ میں مکمل ہوئی۔

۲۴۔ یہ شیخ سعدی کے استاد اور شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی (م۔ ۱۲۶۷ء) کے پیر شیخ
شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے۔ وہ عراقِ عجم کے قصبے سہرورد میں پیدا
ہوئے۔ ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء میں بغداد میں انتقال ہوا۔ "عوارف المعارف" تصوف
پر ان کی نہایت مقبول کتاب ہے۔ اردو زبان میں سب سے پہلے اس کا ترجمہ
مولوی ابوالحسن فرید آبادی نے کیا جو ۱۸۹۳ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۲۵۔ شیخ ابوبکر محی الدین محمد ابن علی المعروف بہ ابن عربی اور شیخ الاکبر کی تالیف ہے۔
وہ ۱۱۶۵ء میں مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۴۰ء میں دمشق میں وفات پائی۔ فصوص
الحکم ۱۲۲۹ء میں دمشق میں مکمل ہوئی۔

۲۶۔ یہ فارسی کے نامور شاعر، عالم اور برگزیدہ صوفی نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی تصنیف
ہے۔ وہ خراسان کے ضلع جام میں ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۴۹۲ء میں ہرات میں
وفات پائی۔ حاکم ہرات نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد
۷، ۱۹۶۲، ص ص ۵۸ - ۶۲)۔

۲۷۔ فخرالدین ابراہیم ہمدانی المعروف بہ اعراقی کی تالیف ہے۔ وہ ہمدان میں پیدا ہوئے۔
قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان آئے اور ملتان میں شیخ بہاءالدین زکریا
کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں دمشق میں انتقال ہوا اور صلاحیہ

Marfat.com

قبرستان میں شیخ محی الدین ابن عربی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (ای۔ جی۔ براؤن، " لٹریری ہسٹری آف پرشیا"، جلد سوم، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، ۱۹۵۶ء، ص ص، ۱۲۵۔ ۱۲۸)۔

۲۸۔ اس کتاب کا پورا نام مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ ہے۔ اس میں صحیحین میں سے ۲۲۴۶ حدیثوں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اس کے مولف علامہ رضی الدین ابوالفضائل حسن بن حسن صغانی کے والد صغان سے آکر لاہور میں آباد ہوگئے تھے۔ ۱۱۷۴ء صغانی اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۱۷ء میں بغداد گئے۔ دو سال بعد عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے ان کو التمش کے دربار میں اپنا ایلچی بنا کر دہلی بھیج دیا۔ ۱۲۳۹ء میں بغداد واپس آئے جہاں ۱۲۵۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ خلیفہ مستنصر باللہ کے حکم سے حدیثوں کا یہ مجموعہ انھوں نے مرتب کیا جس کا ذکر انھوں نے دیباچے میں کیا ہے۔ صغانی ایک ممتاز محدث اور ماہر لسانیات تھے۔ "مشارق الانوار" کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ بڑے بڑے نامور علما نے اس کی شرحیں لکھیں۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۷)

۲۹۔ شافعی مذہب کے عالم، محدث اور مفسر رکن الدین محی السنۃ ابو محمد الحسین بن مسعود بن محمد الفرا البغوی کی تالیف ہے۔ ۱۱۱۷ء یا ۱۱۲۲ء میں مَرْوُ الرّوذ میں ان کا انتقال ہوا۔ بغ یا بغشور وطن تھا جو ہرات کے قریب ایک گاؤں ہے۔ الفرا (پوستین کا تاجر) کا لقب باپ کے پیشے کی وجہ سے ملا۔ ان کی شہرت "مصابیح السنۃ" (یا "مصابیح الدجیٰ") پر مبنی ہے جس میں انھوں نے مضامین کے اعتبار سے ترتیب دے کر احادیث جمع کی ہیں۔ یہ کتاب بولاق اور قاہرہ میں طبع ہوئی۔ عوام میں اس کی مقبولیت خاص کر اس نسخے کی وجہ سے ہے جو ولی الدین (م۔ ۱۳۴۲ء) نے مرتب کیا اور اس کا نام "مشکوٰۃ المصابیح" رکھا۔ ۱۸۰۹ اور ۱۸۱۰ میں اے۔ این

میتھوز نے اس کا انگریزی ترجمہ کلکتہ سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ دوسرا انگریزی ترجمہ مولانا فضل الکریم نے متن کو اپنے طور پر ترتیب دے کر ۱۹۳۸ اور ۱۹۳۹ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ ("اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، جلد چہارم، ۱۹۶۹، ص ص ۶۸۵-۶۸۶)۔

۳۰۔ عربی کے مشہور شاعر اور ماہر لسانیات ابو محمد القاسم بن علی بن محمد بن عثمان الحریری کی تصنیف ہے۔ وہ ۱۰۵۴ء میں بصرہ کے قریب ایک گاؤں مشان میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۲۲ء میں وفات پائی۔ حریری کو شناسائے عالم کرنے والی کتاب "مقامات حریری" ہے جو "مقامات بدیع الزمان ہمدانی" کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ مصنف کی زندگی میں ہی اس نے شہرت حاصل کر لی تھی۔ سلاست اور جدتِ اسلوب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ ("اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، جلد ہشتم، ۱۹۷۳، ص ص ۱۶۲-۱۶۳)۔

۳۱۔ یہ نجم الدین عمر بن علی القزوینی المعروف بہ الکاتبی (م۔ ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء یا ۶۹۳/۱۲۹۱ء) کی منطق پر مشہور کتاب "شمسیہ" کی شرح ہے جس کے مصنف ابو عبداللہ قطب الدین محمود بن محمد رازی (م۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء) ہیں۔ ان کے نام پر یہ "قطبی" کے نام سے مشہور ہے (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ص ۱۵۹، ۱۶۲)۔

۳۲۔ یہ شرح صحائف کوئی اتنی ہی معمولی کتاب ہے کہ طاش کبری زادہ (م۔ ۹۶۸ھ) نے ("الشقائق النعمانیہ" میں) اس کی شرح کا تو ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ صحائف کے متن کے متعلق لکھا ہے: "صحائف سمرقندی کی کتاب ہے۔ میں سمرقندی کے حالات سے مطلع نہ ہو سکا۔" مناظر احسن گیلانی، "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"، جلد اول، دہلی، ۱۹۴۴، ص ۱۲۵۔

۳۳۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی ابو شکور سالمی حصار کے رہنے والے تھے۔ (کتاب مذکور، ص ۱۷۴، فٹ نوٹ)۔

Marfat.com

۳۴۔ ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور، ص ۹۶۔
۳۵۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، جلد اول، ص ۱۰۵۔
۳۶۔ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ تلبنہ کے رہنے والے تھے جو ملتان کی تحصیل خانیوال میں ایک گاؤں ہے۔ آج کل اس کا املا تلمبہ ہے۔ عبداللہ پہلا ہندی عالم ہے جس نے ہندوستان میں فلسفے کے مطالعے کو فروغ دیا۔ اس نے "بدیع المیزان" کے نام سے منطق کی مشہور کتاب "میزان المنطق" کی شرح لکھی۔ یہ شرح اور اصل متن اب بھی مقبول ہیں اور پاک و ہند میں منطق کے طلبا ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۴۱)
۳۷۔ ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور، ص ۹۸۔
۳۸۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، ص ۱۸۹۔
۳۹۔ یہ نحو پر ابن حاجب (م۔ ۱۲۴۹ء) کی مشہور کتاب "کافیہ" کی شرح ہے جو اپنے شارح نور الدین عبدالرحمٰن جامی (م۔ ۱۴۹۲ء) کے نام پر "شرح جامی" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک رائے کے مطابق "شرح جامی" میں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ دراصل قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م۔ ۱۴۴۵ء) کے "کافیہ" کی شرح "شرح الہندی" پر مبنی ہے۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتب مذکور، ص ۲۰۱)۔ خود ابن حاجب کے "کافیہ" کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ وہ جاراللہ زمخشری (م۔ ۵۳۸ھ) کی تالیف "المفصل" کی تلخیص ہے۔ (پروفیسر اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۲۵)۔
۴۰۔ یہ تاج الشریعت محمود (م۔ ۶۷۳ھ) کی تالیف "وقایۃ الروایہ" کی شرح ہے جو ان کے پوتے عبیداللہ بن مسعود، صدر الشریعت ثانی، نے لکھی۔ ان کا انتقال ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں ہوا اور بخارا میں اپنے اسلاف کے قبرستان، شرع آباد میں دفن ہوئے۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۱۶۶)۔
۴۱۔ یہ عبیداللہ بن مسعود (م۔ ۱۳۴۶ء)، صدر الشریعت ثانی، کی تصنیف "التنقیح الاصول"

Marfat.com

کی شرح ہے۔ اس کا پورا نام "التلویح الی کشف حقائق التنقیح" ہے۔ سعدالدین مسعود بن عمر التفتازانی نے اسے ۷۷۸ھ/۱۳۷۷ء میں بمقام گلستان مکمل کیا۔ تفتازانی ۷۲۲ھ/۱۳۲۲ء میں خراسان کے شہر تفتازان میں پیدا ہوئے۔ قاضی عضدالدین ایجی (م۔ ۷۵۶ھ/۱۳۵۴ء) اور قطب الدین رازی (م۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء) سے استفادہ کیا۔ امیر تیمور کے دربار میں صدرِ صدور رہے۔ ۱۳۸۷ء میں شیراز فتح ہونے پر علامہ سید شریف جرجانی (م۔ ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) بھی امیر تیمور کے دربار میں آگئے تو دونوں میں علمی مباحثے ہونے لگے۔ ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں سمرقند میں ان کا انتقال ہوا۔ "تلویح" کے علاوہ ان کی چار اور کتابیں —— "مطول"، "مختصر المعانی"، "شرح عقائد النسفیہ" اور "تہذیب المنطق" عربی مدارس میں رائج ہیں۔ ("اردو دائرۂ معارف اسلامیہ"، ۱۹۶۲، جلد ششم ص ص ۴۸۲-۴۸۸)

۴۲۔ یہ قاضی سراج الدین بن ابی بکر (م۔ ۶۸۹ھ/۱۲۹۱ء) کی منطق پر مشہور کتاب "لوامع الاسرار" کے نام سے غیاث الدین وزیر کے لیے لکھی لیکن یہ مشہور "شرح مطالع" کے نام سے ہوئی۔ ابوعبداللہ قطب الدین محمود بن محمد رازی رے کے گاؤں دوا میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا زیادہ حصہ دمشق میں گزرا اور وہیں ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء میں وفات پائی۔ منطق پر ان کی ایک اور شرح "شرح شمسیہ" یا "قطبی" درجۂ فضل کے نصاب میں شامل ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۲۰۷)۔

۴۳۔ یہ نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد النسفی (م۔ ۵۳۷ھ/۱۱۴۲-۱۱۴۳ء) کی تالیف "عقائد نسفی" کی شرح ہے جو سعدالدین تفتازانی (م۔ ۱۳۸۹ء) نے ۷۶۸ھ/۱۳۶۷ء میں خوارزم میں لکھی۔ ("اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، ۱۹۶۲، جلد ششم، ص ص ۴۸۲-۴۸۸)۔ احمد بن موسیٰ خیالی (م۔ ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء) نے تفتازانی کی شرح پر حاشیہ لکھا اور عبدالحکیم سیالکوٹی (م۔ ۱۶۰۹ء) نے خیالی کے حاشیے پر حاشیہ لکھا۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۲۳)۔

۴۴۔ یہ قاضی عضدالدین عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالغفار الایجی کی ممتاز ترین تصنیف

"المواقف فی علم الکلام" کی شرح ہے جس کے مصنف ابو الحسن علی بن محمد المعروف بہ میر سید شریف جرجانی ہیں۔ قاضی عضد الدین ایجی ۶۸۰ھ/۱۲۸۲ء میں شیراز کے ایک گاؤں ایج میں پیدا ہوئے۔ ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء میں وریمیاں کے قلعے میں وفات پائی جہاں شبانکارہ کے حاکم اردشیر نے انھیں قید کر دیا تھا۔ عہد علائی (۶۹۵ھ - ۷۱۵ھ) کے آخری ایام میں برصغیر پاک و ہند میں آئے اور دیپال پور میں قیام کیا۔ یہاں محمد بن تغلق کو تعلیم دی۔" (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۱۶۸)۔ "مواقف" کے شارح میر سید شریف جرجانی ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں جرجان میں استرآباد کے قریب تاجو نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مصر جا کر قطب الدین رازی (م۔ ۱۳۶۴ء) کے شاگرد مبارک شاہ سے "شرح مطالع" پڑھی۔ شاہ شجاع کے دربار میں ان کی ملاقات علامہ سعد الدین تفتازانی (م۔ ۱۳۸۹ء) سے ہوئی۔ بعد میں سمرقند میں امیر تیمور کے دربار میں بھی دونوں فضلا جمع ہوئے اور دونوں میں خوب علمی بحثیں ہوئیں۔ ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں شیراز میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ("اردو دائرۂ معارف اسلامیہ"، ۱۹۶۸ء، جلد سوم، ص ۶۲۰ - ۶۲۴) "شرح مواقف" کے علاوہ میر سید شریف کی تین اور کتابیں — "صرف میر"، "نحو میر" اور "میر قطبی" عربی مدارس میں رائج ہیں۔

۵۴۔ یہ سراج الدین ابو بکر یوسف بن ابی بکر بن محمد المعروف بہ سکاکی کی "مفتاح العلوم" کے تیسرے حصے کی شرح ہے جو "شرح المطول" کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (م۔ ۱۳۸۹ء) نے اسے ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں بمقام ہرات مکمل کیا۔ سکاکی ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء میں خوارزم میں پیدا ہوا۔ ۶۲۶ھ/۱۱۲۸ - ۱۱۲۹ء میں فرغانہ کے ایک قصبے المالیغ میں اس کا انتقال ہوا۔ سکاکی ترکی زبان کا شاعر تھا لیکن اس کی شہرت کا دار و مدار "مفتاح العلوم" پر ہے جو علم الصرف، علم النحو اور علم البیان والمعانی کے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے کا خلاصہ محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی (م۔ ۱۳۲۸ء) نے "التلخیص المفتاح" کے نام سے کیا جس کی بہت سی

شرحیں لکھی گئیں۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ص ۲۶۷ــ ۲۶۸)۔

۴۶ ۔ یہ عبدالرحمٰن قزوینی کی "تلخیص المفتاح" کی مختصر شرح ہے جسے سعد الدین تفتازانی نے ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء میں بمقام غجدوان مکمل کیا۔

۴۷ ۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، ص ص ۱۹۵ - ۱۹۶۔

۴۸ ۔ اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری (م ۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء) کی "ہدایت الحکمۃ" فلسفے کی ایک مشہور کتاب ہے جو منطق، طبعیات اور الہیات کے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ مذکورہ نصاب میں اس کی شرح شامل تھی جس کے مصنف جلال الدین دوّانی (م ۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء) کے شاگرد میر حسین بن معین الدین میبذی یزدی ہیں۔ یہ شرح عام طور پر "میبذی" کے نام سے مشہور ہے اور صرف الہیات کے حصے کی حامل المتن شرح ہے۔ دوسری شرح صدر الدین محمد بن ابراہیم (م ۔ ۸۲۸ھ/۱۴۲۴ء) نے جو "صدری شیرازی" کے نام سے مشہور ہے، لکھی اور انہی کے نام پر "صدرا" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں شرحیں برصغیر پاک وہند میں بہت مقبول ہیں۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۵۷)

۴۹ ۔ یہ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد النسفی (م ۔ ۱۱۴۳ء) کی "عقائد نسفیہ" کی سعد الدین تفتازانی (م ۔ ۱۳۸۹ء) کی شرح پر حاشیہ ہے جو احمد بن موسیٰ شمس الدین المعروف بہ خیالی (م ۔ ۸۶۰ھ/۱۴۵۹ء) نے لکھا ہے۔

۵۰ ۔ اس کا اصل نام "المنتخب فی اصول المذاہب" ہے لیکن مصنف حسام الدین محمد بن محمد بن عمر (م ۔ ۶۴۴ھ/۱۲۴۷ء) کے نام پر "حسامی العظامی"، "المنتخب الحسامی" یا صرف "حسامی" کے نام سے مشہور ہے۔

۵۱ ۔ یہ عبید اللہ بن مسعود، صدر الشریعت ثانی (م ۔ ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء) کی "التنقیح الاصول" کی شرح ہے جو مصنف نے خود لکھی ہے۔ اس کی ایک اور شرح سعد الدین تفتازانی (م ۔ ۱۳۸۹ء) نے "تلویح" کے نام سے لکھی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۵۲ ۔ یہ طب پر شیخ الرئیس ابو علی سینا (م ۔ ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) کی مشہور کتاب "القانون"

Marfat.com

کا خلاصہ ہے جس کے مصنف علاء الدین ابوالحزم القرشی (م - ۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء) ہیں برہان الدین نفیس عوض الکرمانی نے "المغنیسی" کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔
(ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ۱۷۱)

۵۳ - اس کا پورا نام "کتاب الشمائل النبویہ" ہے جس میں رسول اکرم کی ذات مبارک اور آپ کی صفات مبارک کے متعلق احادیث جمع ہیں۔ اس کے مؤلف امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی ترمذی ۲۰۹ھ/۸۳۱ء میں دریائے جیحوں کے کنارے واقع ایک قدیم شہر ترمذ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۷۹ھ/۹۰۱ء میں آپ کا وصال ہوا۔

۵۴ - دو جلدوں پر مشتمل ۷۲۷۵ صحیح احادیث کے اس مجموعے کا پورا نام "جامع الصحیح" ہے جسے امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ البخاری نے سولہ سال کے عرصے میں مکمل کیا۔ امام صاحب ۱۹۴ھ/۸۱۰ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ خرتنگ سے سمرقند جاتے ہوئے راستے میں ۲۵۶ھ/۸۷۰ء میں آپ کا وصال ہوا۔

۵۵ - سید عبدالواحد معینی مولّف، "مقالاتِ اقبال"، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۵ - ۱۲۶۔

۵۶ - مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، ص ۲۲۳۔

۵۷ - لکھنؤ سے اٹھائیس میل دور قصبہ سہالی میں مسلمانوں کے دو مشہور خاندان آباد تھے: انصاری جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے اور عثمانی جو حضرت عثمانؓ کی اولاد سے تھے۔ ملا نظام الدین اسی قصبے میں ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں انصاری خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملا قطب الدین بڑے جید عالم تھے۔ عثمانیوں اور انصاریوں میں پرانی عداوت چلی آ رہی تھی۔ ایک دن عثمانی ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے اور ان کو قتل کر کے گھر کو آگ لگا دی۔ ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں وہ بے گناہ قتل ہوئے، اس لیے قوم نے ان کو شہید کا لقب دیا۔ ملا قطب الدین کے چار بیٹے تھے۔ باپ کی شہادت کے بعد یہ لوگ سہالی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے۔

Marfat.com

لیکن یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ عالمگیر کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو اس نے ایک فرمان کے ذریعے ملا صاحب کے صاحبزادوں کو فرنگی محل کے محلے میں ایک قطعہ مکان مع متعلقہ عمارات کے عنایت کیا۔ ملا نظام الدین کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی اور "شرح جامی" پڑھتے تھے۔ رفتہ رفتہ قطب الدین شمس آبادی، علی قلی جائسی، امان اللہ بنارسی اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے علوم متداولہ کی تعلیم مکمل کی۔ علوم ظاہری سے فارغ ہو کر علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب بانسوی (م-۱۱۳۵ھ) کے ہاتھ پر بیعت کی جو سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے۔

ملا صاحب نے نصابی کتب پر بہت سی شروح و حواشی لکھے ہیں لیکن ان کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے طریقۂ درس کی بدولت ہے اور بالخصوص ان کے مرتب کردہ اس نصاب کی بدولت جو ان کے نام پر درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کی وجہ سے لکھنؤ کا فرنگی محل منقولات اور معقولات کا معدن بن گیا۔ ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ (سید سلیمان ندوی (مولف)، "مقالات شبلی"، جلد سوم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵، ص ص ۹۱-۱۰۱)

۵۸۔ عربی صرف پر یہ رسالہ ملا حمید الدین کی تصنیف ہے جو ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔

۵۹۔ ابوالحسن علی بن محمد المعروف بہ میر سید شریف جرجانی (م-۱۴۱۳ء) نے یہ رسالہ عربی زبان کے مبتدیوں کے لیے فارسی میں لکھا۔

۶۰۔ ظہیر بن محمود بن مسعود علوی کی تصنیف ہے۔ (مفتی انتظام اللہ شہابی، کتاب مذکور، ص ۴۸)۔

۶۱۔ عربی زبان کی صرف پر فارسی میں یہ کتاب قاضی علی اکبر حسینی الہ آبادی (م-۱۰۹۰ھ/۱۶۷۸ء) کی تصنیف ہے۔ فصول اکبری کے موضوع پر انھوں نے عربی میں بھی ایک کتاب "اصول اکبری" کے نام سے لکھی۔ مصنف عالمگیر کے عہد میں شہزادہ

Marfat.com

محمد اعظم کے اتالیق تھے۔

۶۲۔ یہ عربی زبان کی صرف پر جمال الدین ابوعمرو عثمان المعروف بہ ابن حاجب (م۔ ۱۲۴۹ء) کی تصنیف ہے۔ عربی نحو پر ان کی کتاب "کافیہ" بھی شامل درس ہے۔

۶۳۔ عربی زبان کی نحو پر فارسی میں یہ رسالہ میر سید شریف جرجانی (م۔ ۱۴۱۳ء) کی تصنیف ہے۔

۶۴۔ یہ نحو پر عبدالقاہر بن عبدالرحمن جرجانی (م۔ ۴۷۴ھ/ ۱۰۸۱ء) کی کتاب "مأۃ عامل" کی شرح ہے جس کے مصنف حسین بن عبداللہ نوقانی ہیں۔ ان کا انتقال ۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء میں قسطنطنیہ میں ہوا۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۱۵۵، ۹۵)۔

۶۵۔ پروفیسر اختر راہی نے اس کتاب کو ابوحیان محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان سے منسوب کیا ہے جو غرناطہ میں ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء میں پیدا ہوا اور جس کی وفات ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء میں ہوئی۔ (تذکرۂ مصنفین درس نظامی، ص ۱۹، ۳۷)۔ اس نام کی ایک کتاب ملا عبدالرشید جونپوری (م۔ ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء) نے بھی لکھی ہے جس کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں جتنی مثالیں دی گئی ہیں وہ سب فقہ سے ماخوذ ہیں۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ص ۲۰۱ - ۲۰۲)۔

۶۶۔ یہ ارسطو کی منطق پر میر سید شریف کا مختصر رسالہ ہے۔

۶۷۔ یہ بھی ارسطو کی منطق پر میر سید شریف کا مختصر رسالہ ہے۔

۶۸۔ یونانی مفکر فلاطینوس (۲۰۴ - ۲۶۹ء) کے شاگرد فورفریوس (۲۳۲ - ۳۰۴ء) نے ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق۔م) کی مقولات (CATEGORIES) پر ایک مقدمہ لکھا جو یونانی زبان میں (ISAGOGE) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں فلسفۂ زبان سے بحث کی گئی ہے۔ یونانی کتابوں کے جب المامون کے بیت الحکمت میں عربی میں ترجمے ہوئے تو "مدخل" کے نام سے اس کا بھی ترجمہ ہوا۔ اثیرالدین مفضل بن الابہری (م۔ ۱۲۶۳ء) نے یونانی لفظ کو معرب کر کے اس کا نام "ایساغوجی" رکھا جسے الاخضری نے نظم کیا۔

۶۹۔ کتاب کا پورا نام "غایت تہذیب الکلام فی تحریر المنطق والکلام" ہے جسے سعد الدین تفتازانی نے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں مکمل کیا۔ کتاب کے پہلے حصے کی، جو منطق پر مشتمل ہے، کئی شرحیں لکھی گئیں۔

۷۰۔ یہ تفتازانی کی "تہذیب المنطق" کی شرح ہے۔ شارح کا نام عبد اللہ یزدی (م۔ ۹۸۱ھ/۱۵۷۴) ہے۔

۷۱۔ یہ قطب الدین رازی کی "شرح شمسیہ" کی شرح ہے جس کے مصنف میر سید شریف جرجانی ہیں۔ قطب الدین کی "شرح قطبی" کے نام سے مشہور ہے۔ قطبی کی شرح میر صاحب کے نام پر "میر قطبی" کے نام سے مشہور ہے۔ "شمسیہ" کا مصنف نصیر الدین طوسی (م۔ ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء) کا شاگرد نجم الدین عمر بن علی القزوینی الکاتبی ہے

۷۲۔ قاضی محب اللہ بن عبد الشکور بہاری (م۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کی تصنیف ہے۔ منطق کی مختصر اور جامع کتاب ہے۔ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ "شمسیہ" اور "تہذیب المنطق" کے بعد عربی مدارس میں اس کا درس دیا جاتا ہے

۷۳۔ اثیر الدین بن عمر الابہری (م۔ ۶۶۴ھ/۱۲۶۴ء) کی "ہدایت الحکمۃ" کی شرح ہے جو اپنے شارح صدر الدین محمد بن ابراہیم (م۔ ۱۶۴۰ء) کے نام پر "صدرا" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ایک اور شرح کا نام "میبذی" ہے جو میر حسین بن معین الدین میبذی کی تصنیف ہے۔

۷۴۔ یہ ملا محمود بن شیخ محمد بن شاہ محمد فاروقی جون پوری کی کتاب "الحکمت البالغہ" کی شرح ہے جو انھوں نے خود لکھی ہے۔ پہلے "قلت" لکھ کر اپنی کتاب سے عبارت پیش کی ہے پھر "اقول" لکھ کر اس کی تشریح کی ہے۔ ملا محمود ۹۹۳ھ/۱۵۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۶۲ھ/۱۵۸۴ء میں جون پور میں وفات پائی۔ کچھ عرصہ شاہجہاں کے دربار سے منسلک رہے۔

۷۵۔ یہ بہاء الدین محمد بن حسین العاملی کی تصنیف ہے۔ عصمت اللہ بن عظمت اللہ سہارن پوری (م۔ ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء) نے اس کی سب سے پہلی شرح

Marfat.com

"انوار خلاصۃ الحساب" کے نام سے لکھی۔ دوسری شرح لطف اللہ مہندس بن استاد احمد العماد نے لکھی جس کا نام "شرح خلاصۃ الحساب" ہے لطف اللہ نے اصل کتاب کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا ہے۔ ۱۸۱۲ء میں روشن علی نے بھی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر نسل مین نے اس کو اڈٹ کیا ہے اور ارسٹائیڈ مار نے اس کا فرانسیسی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ (ڈاکٹر زبید احمد، کتاب مذکور، ص ص ۱۶۶۔۱۶۸) العاملی ۹۵۳ھ/۱۵۴۸ء میں جبل عامل (شام) میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں طوس میں وفات پائی اور وہیں دفنائے گئے۔ شاہ عباس صفوی کے عہد میں اصفہان کے قاضی رہے۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۷۷)

۷۶۔ یہ خواجہ نصیر الدین طوسی (م۔ ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء) کی تالیف ہے۔ جن کی ترغیب پر ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا اور عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

۷۷۔ یہ بہاء الدین عاملی (م۔ ۱۶۲۲ء) کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح امام الدین الریاضی بن لطف اللہ مہندس نے "تقریح" کے نام سے لکھی جو بہت معروف ہے۔ امام الدین الریاضی ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں پیدا ہوئے ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۳ء میں وفات پائی۔ ان کے دادا احمد معمار لاہوری نے تاج محل کا حسین پیکر تراشا۔

۷۸۔ علاء الدین قوشجی کی تصنیف ہے۔

۷۹۔ چغمین بخارا کے قریب ایک گاؤں ہے۔ یہاں کے علامہ محمود بن محمد الچغمینی الخوارزمی نے ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء میں علم ہیئت پر ایک اہم کتاب "الملخص فی الہیئت البسیط" لکھی جو "چغمینی" کے نام سے مشہور ہے۔ موسیٰ پاشا بن محمد قاضی محمود رومی عرف قاضی زادہ (م۔ ۸۴۱ھ/۱۴۳۸ء) نے ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں "الملخص" کی شرح لکھی اور الغ بیگ (م۔ ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء) کے نام معنون کی جو شرح چغمینی کے نام سے مشہور ہے (اختر راہی، کتاب مذکور،

Marfat.com

ص ص ۱۵۱ ، ۲۵۲)۔

۸۰۔ یہ البو البرکات حافظ الدین عبد اللہ بن احمد نسفی (م۔ ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء) کی تالیف "منار الانوار" کی شرح ہے جس کے مصنف عالمگیر کے استاد شیخ احمد بن ابو سعید بن عبد اللہ المعروف بہ ملا جیون ہیں ۔ ۱۱۰۵ھ میں انھوں نے اسے مدینہ منورہ میں مکمل کیا۔ ملا صاحب ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں لکھنؤ کے ایک قصبے امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں دہلی میں وفات پائی ۔

۸۱۔ یہ قاضی محب اللہ بہاری (م۔ ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی مشہور تصنیف ہے منطق میں ان کی "مسلم العلوم" بھی نصاب میں شامل ہے۔

۸۲ علم کلام پر محقق جلال الدین دوانی (م۔ ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲ء) کی کتاب کی شرح ہے۔ "اخلاق جلالی" ان کی معروف ترین تالیف ہے۔

۸۳۔ میر سید شریف جرجانی نے قاضی عضد الدین ایجی کی کتاب "المواقف فی علم الکلام" کی شرح لکھی۔ میر محمد زاہد ہروی بن قاضی محمد اسلم نے اس شرح پر حاشیہ لکھا جس کا نام "حاشیہ علی الامور العامہ من شرح المواقف" ہے۔ لیکن یہ رسالہ میر زاہد کے نام سے مشہور ہے۔ میر زاہد کے والد جہانگیر کے عہد میں ہرات سے لاہور آئے اور کابل کے قاضی مقرر ہوئے یہیں میر زاہد کا ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء میں انتقال ہوا۔

۸۴۔ اس تفسیر کا آخری نصف حصہ ،سورہ الکہف سے الناس تک اور پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر ،جلال الدین محلی بن احمد محلی الشافعی نے لکھا۔ آپ ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ ۸۶۴ھ/ ۱۴۵۹ء میں وفات پائی۔ پہلے نصف حصے کی تفسیر ابو الفضل عبد الرحمٰن جلال الدین سیوطی نے ۸۷۰ھ میں مکمل کی۔ علامہ سیوطی ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء میں وفات پائی۔ اپنے مولفین کے نام پر یہ تفسیر جلالین کے نام سے مشہور ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے علما نے بکثرت اس پر حواشی لکھے۔ اس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ قرآن مجید اور اس کے الفاظ و حروف عدداً برابر ہیں۔

۸۵ - بحوالہ شیخ محمد اکرام: "رود کوثر"، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۸، ص ۶۰۶ -
۸۶ - قرآن مجید، ۵۱ : ۲۱ -
۸۷ - قرآن مجید، ۲ : ۲۶۹ -
۸۸ - قرآن مجید،
۸۹ - قرآن مجید، ۴۱ : ۵۳ -
۹۰ - اقبال، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، مترجم سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸، ص ۱۹۳ -
۹۱ - ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور، ص ۱۰۳ -
۹۲ - "مقالات شبلی"، جلد سوم، ص ص ۹۹ - ۱۰۰ -
۹۳ - قرآن مجید، ۱۴ : ۵ -
۹۴ - "مقالات شبلی"، جلد سوم، ص ۱۰۰ -
۹۵ - ایضاً، ص ۱۰۰ -
۹۶ - ایضاً، ص ۱۰۱ -
۹۷ - یہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م - ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء) کے ناتی صفی الدین بن نصیر الدین بن نظام الدین ردولوی کی تصنیف ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے ابوالمکارم اسماعیل کے لیے لکھی۔ ان کے دادا نظام الدین سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد میں غزنی سے دہلی آئے تھے۔
۹۸ - یہ رسالہ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے حافظ وزیر علی کی فرمائش پر جزیرۂ انڈمان میں بحالت قید لکھا۔ مفتی صاحب ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء میں دیوہ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں ان کا خاندان کاکوری میں آباد ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے سلسلے میں ان پر بغاوت کا الزام لگا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ انڈمان سے واپسی پر کانپور میں سکونت اختیار کی اور وہاں "فیض عام" نامی ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء میں حج کو جاتے ہوئے ان کا جہاز جدہ کے قریب ایک

Marfat.com

چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔

۹۹۔ یہ عبدالقاہر بن عبدالرحمٰن جرجانی (م۔ ۴۷۴ھ/۱۰۸۱ء) کی تصنیف ہے۔ حسین بن عبداللہ نوقانی (م۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) نے اس کی شرح لکھی۔

۱۰۰۔ یہ کتاب احمد بن محمد تقی بن محمد علی بن ابراہیم شروانی یمنی نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ملازمت کے دوران میں لکھی اور پہلی مرتبہ ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ احمد یمنی شروانی ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں یمن کے شہر حُدیدہ میں پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب میں ہندوستان آئے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں عربی زبان کی تدریس کی خدمت انجام دی۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں پونا میں انتقال ہوا۔ کتاب کا پورا نام "نفحۃ الیمن فی مایزول بذکرہ الشجن" ہے۔

۱۰۱۔ شعرائے عہد جاہلیت کے کلام کا مجموعہ ہے۔

۱۰۲۔ یہ ابوطیب احمد بن حسین الکندی المعروف بہ المتنبی کا دیوان ہے۔ احمد بلند پایہ شاعر اور فصیح البیان ادیب تھا۔ اسے اپنے کلام پر اتنا ناز تھا کہ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اسی نسبت سے المتنبی (جھوٹا نبی) مشہور ہوا۔ وہ ۳۰۳ھ/۹۱۵ء میں کوفہ کے محلے کندہ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ سقہ کا کام کرتا تھا۔ ۳۵۴ھ/۹۶۵ء میں وہ شیراز سے کوفہ جا رہا تھا۔ راستے میں رہزنوں نے حملہ کر دیا اور وہ اس ہنگامے میں کام آ گیا۔

۱۰۳۔ یہ مجموعۂ اشعار ابوتمام حبیب بن اوس الطائی نے ہمدان میں ابوالوفا بن سلمہ کے کتب خانے سے فائدہ اٹھا کر مرتب کیا۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور "تسہیل الدراسہ" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ الصولی نے "حماسہ" کو حروف تہجی کے اعتبار سے اور علی بن حمزہ الاصفہانی نے مضامین کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ ابوتمام ۱۹۰ھ/۸۰۶ء دمشق کے ایک گاؤں جاسم میں پیدا ہوا۔ ۲۳۲ھ/۸۴۶ء میں موصل میں وفات پائی۔

Marfat.com

۱۰۴۔ یہ اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری (م۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء) کی "الیاغوجی" کی شرح ہے جو مؤلف نے خود لکھی ہے۔ "الیاغوجی" کو "الاثیریہ فی المیزان" بھی کہتے ہیں۔

۱۰۵۔ غالباً یہ منطق کی وہی مشہور کتاب ہے جس کی شرح خود اس کے مصنف عبداللہ تلنبی (م۔۱۵۱۶) نے "بدیع المیزان" کے نام سے لکھی۔ (اختر راہی، کتاب مذکور، ص ۱۹۳)۔

۱۰۶۔ یہ محب اللہ بہاری (م۔ ۱۷۰۷ء) کی منطق پر مشہور کتاب "سلم العلوم" کی شرح ہے جو اپنے شارح ملا محمد حسن فرنگی محلی (م۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء) کے نام پر "ملا حسن" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۰۷۔ یہ بھی "سلم العلوم" کی شرح ہے جو حمد اللہ سندیلوی (م۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) کے نام پر "حمد اللہ" کے نام سے معروف ہے۔ حیدر علی سندیلوی، حکیم شریف خاں دہلوی اور مفتی عبداللہ ٹونکی نے اس شرح پر حواشی لکھے ہیں۔

۱۰۸۔ یہ قاضی محمد مبارک گوپاموی (م۔ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) کی "شرح سلم العلوم" ہے جو "قاضی مبارک" کے نام سے معروف ہے۔

۱۰۹۔ قطب الدین رازی (م۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء) نے تصور و تصدیق کے موضوع پر ایک مختصر اور جامع رسالہ لکھا جو "رسالۃ التصور و التصدیق" اور "رسالہ قطبیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ میر محمد زاہد ہروی (م۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) نے اس رسالہ پر حاشیہ لکھا اور اس کا نام "الحاشیہ الزاہدیۃ القطبیہ" رکھا لیکن یہ "رسالہ میر زاہد" کے نام سے معروف ہے۔ غلام یحییٰ بہاری (م۔ ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۵ء) نے اس رسالے (حاشیہ) پر حاشیہ لکھا جو ان کے نام پر "حاشیہ غلام یحییٰ بر رسالہ میر زاہد" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۱۰۔ یہ سعد الدین تفتازانی (م۔ ۱۳۸۹ء) کی "تہذیب المنطق" کی شرح ہے جو اپنے شارح ملا جلال الدین دوانی (م۔۱۵۰۲) کے نام پر "ملا جلال" کے نام

Marfat.com

سے مشہور ہے۔

۱۱۱۔ یہ ملا محمد مبین (م۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کی شرح سلم العلوم ہے جس کا اصل نام "مرأة الشروح" ہے۔

۱۱۲۔ یہ "حاشیۃ الزاہدیۃ القطبیۃ" یا "رسالہ میر زاہد" پر عبد العلی محمد بحر العلوم کا حاشیہ ہے جو "الحاشیہ علی حاشیہ میر زاہد علی رسالہ القطبیۃ" کے نام سے موسوم ہے۔ عبد العلی فرنگی محلی ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں مدراس میں وفات پائی۔ آپ ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے صاحبزادے ہیں۔

۱۱۳۔ یہ عبد العلی محمد بحر العلوم فرنگی محلی کی "شرح سُلم العلوم" ہے۔

۱۱۴۔ یہ بہاء الدین عاملی (م۔ ۱۶۲۲ء) کی "تشریح الافلاک" کی شرح ہے جس کے مؤلف امام الدین الریاضی بن لطف اللہ مہندس (م۔ ۱۷۳۳ء) ہیں شرح تشریح غالباً کوئی الگ کتاب نہیں ہے۔ تصریح کی وضاحت کرنے کے لیئے ابو الحسنات ندوی نے اس کے آگے "شرح تشریح" لکھ دیا ہے۔

۱۱۵۔ علم میراث کی کتاب ہے۔

۱۱۶۔ یہ عبد الرشید دیوان کی تالیف ہے۔ دیوان صاحب ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء میں جون پور کے ایک نواحی گاؤں بروند میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں وفات پائی۔

۱۱۷۔ یہ "نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر" کی شرح ہے جو مصنف ابو الفضل شہاب الدین احمد عسقلانی المعروف بہ ابن حجر نے خود "نزہت النظر فی توضیح نخبۃ الفکر" کے نام سے لکھی۔ ابن حجر ۷۷۳ھ/۱۳۷۲ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں وفات پائی۔

۱۱۸۔ دو جلدوں پر مشتمل صحیح احادیث کے اس مجموعے کا پورا نام "صحیح مسلم" ہے "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" دونوں کو ملا کر "صحیحین" کہتے ہیں۔ "صحیح مسلم" کے مؤلف

امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری ۲۰۲ھ/۸۲۴ء میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۶۱ھ/۸۷۴ء میں وفات پائی۔ "صحیح مسلم" ۲۵۷ھ/۸۷۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۱۱۹۔ موطا، امام مالک کی تالیف ہے۔ وہ ۹۳ھ/۷۱۱ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ۱۷۹ھ/۷۹۵ء میں وفات پائی۔

۱۲۰۔ احادیث کے اس مجموعے کا پورا نام "الجامع الترمذی" ہے۔ یہ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م - ۲۷۹ھ/۹۰۱ء) کی تالیف ہے۔ اسے "سنن ترمذی" بھی کہتے ہیں۔

۱۲۱۔ دو جلدوں پر مشتمل ۴۸۰۰ احادیث کے اس مجموعے کا پورا نام "السنن ابی داؤد" ہے۔ اس کے مؤلف امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث بن اسحاق سجستانی ۲۰۲ھ/۸۱۷ء میں سجستان میں پیدا ہوئے۔ ۲۷۵ھ/۸۸۹ء میں بصرہ میں وفات پائی۔

۱۲۲۔ احادیث کے اس مجموعے کے مؤلف امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی ۲۱۵ھ/۸۳۰ء میں خراسان کے ایک گاؤں نسا میں پیدا ہوئے۔ ۳۰۳ھ/۹۱۵ء میں وفات پائی۔ امام صاحب نے سب سے پہلے حدیث کی جو کتاب لکھی اس کا نام "سنن کبریٰ" تھا۔ امیر رملہ کی خواہش پر اس بڑی کتاب میں سے صرف صحیح احادیث منتخب کر کے ایک نئی کتاب مرتب کی جس کا نام انھوں نے "سنن صغریٰ" (المجتبیٰ من السنن الکبریٰ) رکھا۔ اسی کو آج ہم "مجتبیٰ" اور "نسائی شریف" کہتے ہیں

۱۲۳۔ اس کا پورا نام "السنن ابن ماجہ" ہے۔ ۴۳۴۱ احادیث میں سے اس میں ۳۰۰۲ حدیثیں وہ ہیں جو صحاح کی باقی پانچ کتابوں میں بھی ہیں باقی ۱۳۳۹ خود ابن ماجہ نے منتخب کی ہیں اس کے مؤلف ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ ۲۰۹ھ/۸۲۴ء میں قزوین میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۷۳ھ/۸۸۶ء میں وفات پائی۔ ان کی ماں کا نام ماجہ تھا۔ اسی کے نام پر وہ ابن ماجہ کے نام سے مشہور ہوئے ابوالفضل بن طاہر مقدسی نے ابن ماجہ کو صحاح میں شامل کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ اسے صحاح میں شامل نہیں کرتے۔ اس کی جگہ وہ "موطا" امام مالک کو دیتے ہیں۔

۱۲۴۔ ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور ص ۱۰۶۔

۱۲۵۔ "مقالات شبلی"، جلد سوم، ص ۱۳۱۔

۱۲۶۔ ابوالحسنات ندوی، کتاب مذکور، ص ۱۰۷۔

۱۲۷۔ "مقالات اقبال"، ص ۱۳۵۔

۱۲۸۔ عبدالمجید سالک، "مسلم ثقافت ہندوستان میں"، ص ۲۶۸۔

۱۲۹۔ یہ رسالہ فخر الدین زرادی (م۔ ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) نے اپنے ایک بنگالی پیر بھائی سراج الدین عثمان کے لیے لکھا تھا اور ان کے نام پر اس کا نام "عثمانیہ" رکھا تھا۔ بعد میں مولف کے نام پر "زرادی" کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۳۰۔ اس کا اصل نام "التصریف العزی" ہے۔ بعد میں عزالدین ابو المعالی عبدالوہاب بن ابراہیم زنجانی مولف کے نام پر اس کا نام "زنجانی" پڑ گیا۔ انھوں نے ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں بغداد میں وفات پائی۔

۱۳۱۔ عربی زبان کی قواعد پر فارسی میں یہ رسالہ بہاء الدین عاملی (م۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء) کی تالیف ہے۔

۱۳۲۔ یہ احمد بن علی بن مسعود کی تالیف ہے۔

۱۳۳۔ یہ میر سید شریف کی "کافیۂ" ابن حاجب" کی فارسی شرح کا عربی ترجمہ ہے مترجم عبدالحق بن فضل حق خیر آبادی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔

۱۳۴۔ ابن حاجب کی "کافیہ" کی ایک شرح ملا عبدالرحمٰن جامی نے لکھی۔ ان کے شاگرد اور مرید رضی الدین عبدالغفور لاری (م۔ ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) نے اس شرح پر حاشیہ لکھا جو "حاشیہ شرح جامی" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۳۵۔ فضل امام خیر آبادی (م۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) کی تصنیف ہے۔

۱۳۶۔ مجاہد جنگ آزادی علامہ فضل حق بن فضل امام خیر آبادی کی تالیف ہے۔ آپ خیر آباد میں ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں جوانی گزاری، لکھنو میں

Marfat.com

بوڑھے ہوئے اور انڈیان میں ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔

۱۳۷۔ یہ سراج الدین ابوبکر یوسف المعروف بہ سکاکی (م۔ ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) کی "مفتاح العلوم" کے تیسرے حصے کا خلاصہ ہے جس میں علم البیان والمعانی سے بحث کی گئی ہے۔ مولف کا نام محمد بن عبدالرحمن قزوینی (م۔ ۷۳۹ھ/۱۳۳۹ء) ہے۔

۱۳۸۔ یہ طریق نماز پر لطف اللہ نسفی المعروف بہ فاضل کیدانی کا مختصر رسالہ ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ شیخ جمال نے زیب النسا کی فرمائش پر کیا۔ پشتو ترجمہ "توضیح المعانی" میاں محمد عمر چمکنی نے کیا۔

۱۳۹۔ یہ سدید الدین کاشغری کی تالیف ہے جس کا پورا نام "منیۃ المصلی وغنیۃ المبتدی" ہے۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

۱۴۰۔ حنفی فقہ کی اس کتاب کے مولف حسن بن عمار بن علی الشرنبلامی ہیں۔ وہ ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۵ء میں مصر کے ایک گاؤں بلولہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ ازہر میں تعلیم پائی۔ ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

۱۴۱۔ اس کا پورا نام "مختصر القدوری" ہے۔ جس کے مولف ابوالحسن احمد بن محمد قدوری ہیں۔ قدور قدر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ہنڈیا۔ شاید کمہاروں کے محلے میں رہنے یا مٹی کے برتن بیچنے کی وجہ سے قدوری مشہور ہوئے۔ وہ ۳۶۲ھ/۹۷۲ء میں بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں فوت ہوئے۔

۱۴۲۔ یہ ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی (م۔ ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) کی "وافی فی الفروع" کی تلخیص ہے جو مولف نے خود کی ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں اور فارسی اور اردو میں ترجمے ہوئے۔

۱۴۳۔ علم الفرائض والمواریث کی اس کتاب کے مولف ابوطاہر سراج الدین محمد بن محمد سجاوندی ہیں۔ یہ "سراجیہ" کے نام سے بھی معروف ہے۔

۱۴۴۔ "اصول الشاسی" کے مولف کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اتفاق نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ ابویعقوب اسحاق بن ابراہیم الشاسی السمرقندی (م۔ ۳۲۵ھ/۹۳۷ء)

Marfat.com

کی تالیف ہے۔

۱۴۵۔ یہ شاہ ولی اللہ (م۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی تالیف ہے۔

۱۴۶۔ محمد احسن بن لطف علی نانوتوی (م۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) اس کتاب کے مصنف ہیں۔ غزالی کی "احیاء علوم الدین" کا "مذاق العارفین" کے نام سے اردو میں سلیس اور بامحاورہ ترجمہ انہی نے کیا ہے۔

۱۴۷۔ عربی زبان کے بلند پایہ ادیب و شاعر اعزاز علی بن محمد مزاج علی دیوبندی (م۔ ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء) کی تالیف ہے جسے انھوں نے شیخ احمد یمنی کی "نفحۃ الیمن" کے انداز پر ترتیب دیا ہے۔

۱۴۸۔ یوسف بن ابی بکر سکاکی (م۔ ۱۲۲۸ء) کی "مفتاح العلوم" کے تیسرے حصے (معانی و بیان) کا خلاصہ ہے۔

۱۴۹۔ "ضرب کلیم"، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۵۴۱۔

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۵۴۵

۱۵۱۔ "بالِ جبریل" (کلیات اردو)، ص ۳۹۸۔

۱۵۲۔ "ضرب کلیم"، (کلیات اردو)، ص ۵۴۷۔

۱۵۳۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، ص ۳۲۲-۳۲۳۔

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۳۲۴۔

۱۵۵۔ "مقالاتِ شبلی"، جلد سوم، ص ص ۱۰۲-۱۰۳۔

۱۵۶۔ مہدی نختیں، "ہسٹری آف اسلامک اورجنز آف ولیسٹرن ایجوکیشن"، کلورڈو، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱۸۔

۱۵۷۔ "مقالات شبلی"، جلد سوم، ص ۸۱۔

۱۵۸۔ ایضاً، ص ص ۸۴-۸۵۔

۱۵۹۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، ص ۳۲۵۔

۱۶۰۔ شبلی، "الغزالی"، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ص ۵-۶۔

۱۶۱۔ مناظر احسن گیلانی، کتاب مذکور، جلد دوم، ص ۸۴۔

محمد اقبال مجددی

Marfat.com

Marfat.com

برِصغیر پاک و ہند کے قدیم [illegible]
نصاب کیا تھا ؟ — یہ ایک اہم تاریخی [illegible]
کب اور کیونکر عالمِ وجود میں آیا اور پھر [illegible]
میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں ؟ — فاضل مصنف [illegible]
اس کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔

6135

Marfat.com